نئی اور پرانی تعلیم

پروفیسر عبدالغفور چودھری

مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج علی گڑھ

کتابی دنیا لمیٹڈ۔ دہلی

تعداد طبع ۱۰۰۰ مئی ۴۷ء

فہرست مضامین

صفحات

مسلم لیگ پرنٹنگ پریس دریا گنج دہلی
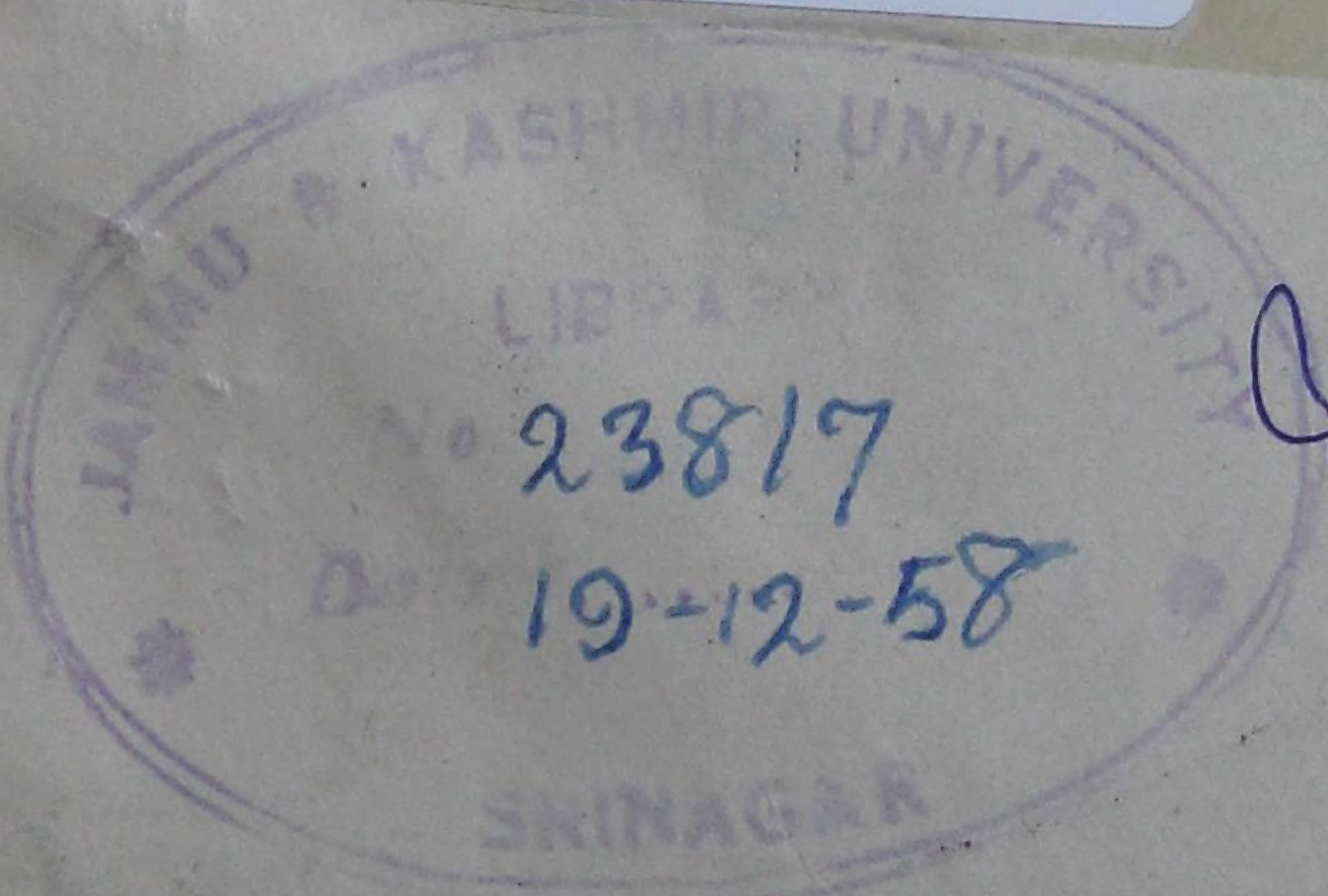
تعارف

پروفیسر عبدالغفور صاحب میرے پرانے دوست اور ساتھی ہیں ہم دونوں
نے کئی سال تک علی گڈھ ٹریننگ کالج میں ساتھ کام کیا ہے۔ اس رفاقت کے دوران
میں مجھے اندازہ ہوا کہ انہیں علمی اور تعلیمی کام میں کس درجہ شغف اور انہماک ہے کسی
کالج یا یونیورسٹی میں کام کرنے والے کے لئے یہ بات بظاہر قابل ذکر معلوم نہیں
ہوتی کیونکہ اس سے تو توقع ہی کی جاتی ہے کہ وہ علم و ادب میں دلچسپی لے لیکن
بدقسمتی سے ہمارے علمی اداروں میں صورت حال بالکل مختلف ہے۔ وہاں ایسے
لوگ بہت کم ہیں جنہوں نے علم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے اور ایسے بہت ہیں
جنہوں نے طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ حالات کے جبر سے اور
ی کمانے کے لئے معلمی کا پیشہ اختیار کرلیا ہے اور وہ اپنی مالی محرومیوں کی
نی کمیٹیوں کی ممبری اور معائینوں کی فیس وغیرہ کے ذریعے کرنے کی دھن میں لگے
رہتے ہیں۔ غفور صاحب کا شمار اس ممتاز اقلیت میں ہے جس کو اپنے کام سے کام
ہے اور علمی مشاغل اور تصنیف و تالیف میں اظہار خودی کا لطف حاصل ہوتا ہے۔
اور جو غیر متعلق لغویتوں سے کرامت کے ساتھ گذر جاتے ہیں!

غفور صاحب عرصے سے تعلیم پر مضامین لکھتے رہے ہیں اور انھوں نے
مختلف تعلیمی مسئلوں پر ایک شگفتہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ زیر نظر کتاب
ان میں سے چند تعلیمی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں انھوں نے نئی اور پرانی تعلیم کے
بعض اہم پہلوؤں کو ایک دل چسپ اور عام فہم انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی نظر
کی خوبی یہ ہے کہ وہ دونوں کی اچھی اور بری باتوں کو پرکھ سکتے ہیں۔ وہ نہ قدیم سے
محض اس لئے بیزار یا مسحور ہیں کہ وہ قدیم ہے۔ نہ جدید سے اس وجہ سے خائف یا
مرعوب ہیں کہ وہ جدید ہے۔ وہ ایک کی روایت پرستی اور تنگی پر تنقید کرتے ہیں اور
دوسری کی سطحیت اور مذہب اور تہذیب سے بے تعلقی پر معترض ہیں۔ دوسری
طرف وہ قدیم تعلیم کی عین پسندی اور اس کے استادوں کی فرض شناسی اور بے
غرضی کو سراہتے ہیں اور جدید تعلیم کے ان اصولوں کے قائل ہیں جو بچوں کی نفسی
ضروریات پر تعلیم کے نظام کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ دونوں کی حقیقی روح کی جھلک
ان چھوٹے چھوٹے دل لگتے قصوں میں دکھائی دیتی ہے۔ جو کتاب میں جا بجا موتیوں
کی طرح ٹکے ہوئے ہیں۔ مثلاً کس قدر سبق آموز ہے اس عالم کا قصہ جو بادشاہ وقت
کی دعوت کو یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ جب تک کھانے کو سوکھی روٹی میسر ہے میں
سلاطین کی دریوزہ گری نہیں کرسکتا۔ اگر سچ مچ طلب علم ہے تو بادشاہ خود میرے
پاس آئے میں اس کے حضور میں کیوں حاضر ہوں! یا سندھ کے سلطان
ناصر الدین قباچہ کا قصہ (اگر وہ صحیح ہے) اس نے اپنے بیٹے کی تعلیم ایک ملاجی

کے سپرد کی تھی جن کو جسمانی سزا دینے کا مرض لاحق تھا۔ انھوں نے ایک مرتبہ کسی بات پر شاہزادے کو اتنا مارا کہ وہ جاں بحق تسلیم ہوگیا۔ (خدا ملاجی کو معاف کرے۔ نئی تعلیم تو انہیں معاف نہیں کرسکتی!) بادشاہ کو خبر ہوئی تو شام کے وقت چھپ کر ان کے گھر پہنچا اور ایک اشرفیوں کی تھیلی اور اپنا تیز رفتار گھوڑا نذر کرکے مشورہ دیا کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے ملک کی سرحد سے باہر نکل جائیں ورنہ جب ملکہ کو اس حادثے کی خبر ہوگی تو "ایک ماں کے جذبہ انتقام سے انہیں ایک بادشاہ کی قوت بھی نہ بچا سکے گی!" کہاں ہیں اب علم، عالموں اور اُستادوں کے ایسے قدرداں جو اس زمانے میں پائے جاتے تھے جب تعلیم کا اس درجہ چرچا نہ تھا۔ قدیم تعلیم کے نامہ اعمال میں ان چیزوں کو بھی شامل کرنا ضروری ہے!

ایک باب میں غفور صاحب نے پچھلی صدی میں دیسی تعلیم کی کہانی بیان کی ہے اور اس میں بعض حق پسند انگریزوں کی زبانی پتے کی باتیں بتائی ہیں۔ جن کا مطالعہ اُستادوں کے لئے یقیناً مفید ہوگا۔ اور انہیں اندازہ ہوگا کہ آج کی تعلیمی تحریکوں کا پس منظر کیا تھا۔ ماضی کا مطالعہ اس لئے ضروری نہیں کہ ہمیں ماضی کی تقلید مقصود ہے بلکہ قانون قدرت ہی یہ ہے کہ ہم ماضی کو بھلا کر اسے نظر انداز کرکے مستقبل کی طرف کوئی یقینی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ بے شک ہم تعلیم میں (اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں) انقلاب چاہتے ہیں لیکن اس انقلاب

کی راہبری کے لئے ان قوتوں کو سمجھنا اور ان کا محاسبہ کرنا ضروری ہے جنہوں نے ہمارے ماضی اور حال کو بنایا ہے۔ غفور صاحب نے اپنے خاص انداز میں ان قوتوں کی کارفرمائی کی طرف توجہ دلائی ہے۔

لیکن انھوں نے سب سے زیادہ زور اُستادوں کی شخصیت، اُن کی تربیت اور ان کے فرائض پر دیا ہے اور بہت سے مختلف اور دلچسپ طریقوں سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اُستاد سماج کی تعمیر اور اس کی خدمت کے لئے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک تعلیم کی نئی عمارت بنانے میں اُستاد کی مرکزی حیثیت ہے اور جب تک سماج کو اس کی اہمیت کا احساس نہ ہو اور اس کی پاسداری عزیز نہ ہو اور جب تک اُستاد سماج کی خدمت کو اپنی معراج نہ سمجھے اس وقت تک تعلیم کا کام محض دوکاندار کا سودا ہے بہتر انسانوں کی تخلیق کا ذریعہ نہیں اور چونکہ غفور صاحب کا عقیدہ ہے کہ دراصل ایک اچھے مدرسہ اور ایک اچھے اُستاد کا کام بہتر انسانوں کو بنانا ہے اس لئے وہ اُستاد کی عین پسندی، اس کے ایثار، اس کی بلند نظری اور اس کے دل سے گداز کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس پر تنقید کرتے ہیں ایک ہمدرد اور دل سوز دوست کی طرح اور اسے سراہتے ہیں ایک رفیق کی طرح۔ اس لئے مجھے اُمید ہے کہ ہمارے اُستاد اس کتاب کو مفید اور خوشگوار پائیں گے۔

خواجہ غلام السیدین

پیش لفظ

"نئی اور پرانی تعلیم" بیشتر ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں ادبی نشستوں یا اُستادوں کی انجمنوں میں پڑھے گئے ان میں سے بعض پہلے شائع ہو چکے ہیں اور اب انھیں نظرِ ثانی کے بعد اس مجموعے میں شامل کیا جا رہا ہے۔ یہ مضامین بظاہر کسی ایک سلسلے کی کڑیاں نہیں لیکن ان میں ایک معنوی ربط موجود ہے۔ یہ محض بعض تعلیمی موضوع ہی پیش نہیں کرتے بلکہ ایک مخصوص تعلیمی نقطۂ نگاہ کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔

ہماری تعلیمی تاریخ ایک مربوط اور منظم سلسلہ نہیں، اس کی کڑیاں جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہیں۔ پرانی اور انگریزی تعلیم کے درمیان

تو ایک خلیج ہے۔ اور ہمارے تعلیمی نظم و نسق، تدوینِ نصاب کی سر زمین پہ آئیں میں تو خلیج ہی نہیں بلکہ خوفناک کھڈیں بھی ہیں۔ جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو ہندو اور مسلم عہد کا تعلیمی دور افسانے کی شہزادی کے اس پھولوں کے ہار کی طرح معلوم ہوتا ہے جو اتفاقاً دریا میں گرا اور بہتا بہتا دُور اُفق کے پار چلا گیا۔ لیکن موجودہ تعلیمی ترقی یا تنزل کو صحیح پس منظر میں دیکھنے کے لئے ہمیں ماضی کا جائزہ لینا ہوگا اور گم گشتہ کڑیوں کو ڈھونڈ کر دوبارہ آپس میں ملانا ہوگا۔ کیونکہ زندگی کے دھارے اکثر سطح پر نہیں بہتے بلکہ غیر شعوری طور پر زیرِ آب چلتے ہیں۔ ان کے اثرات آنکھوں سے دیکھے نہیں جا سکتے لیکن دل کی گہرائیوں میں برابر تلاطم پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یہی حال ماضی کا ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ ہمارا ماضی زندہ درگور ہوا۔ یہ زندہ ماضی ابھی تک رواں دواں ہے۔ یہی ماضی ہمارے گلے کا ہار اور جان کا آزار اور یہی عروسِ تعلیم کا چندن ہار بن سکتا ہے۔

ہمارا ماضی کا مطالعہ اکثر غیر متوازن ہو کے رہ جاتا ہے اس بچے کی طرح جو عملی زندگی کے ناقابل ہو کر زندگی نہیں زندگی کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ ہم بھی اکثر ماضی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے رنگین افسانوں، اس کی پُر عظمت داستانوں میں بہہ جاتے

ہیں۔ بزرگوں کے کارناموں پر ہمارا استعجاب بڑھتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہماری نظروں میں ان کے قد وقامت بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ وہ ہمیں ایسی دیو قامت شخصیتیں معلوم ہوتی ہیں جن کے سر بادلوں سے اُوپر اُٹھے ہوتے ہوں۔ ماضی کے اس مطالعہ کا مقصد یا تو ذہنی لطف اندوزی ہوتا ہے، یا اپنی بے عملی کی تلخی دُور کرنے کے لئے افیون کا ایک جرعہ حاصل کرنا اور بس!

پُرانی تعلیم کے مطالعہ سے ہمارا مقصد نہ تو نالندہ کے رومانی افسانے دوہرانا ہے نہ جونپور کے راگ الاپنا۔ ہمارا مقصد تو اس کے مطالعہ سے ان زندگی بخش اثرات کا تجزیہ کرنا ہے جس نے ہمارے نظام تعلیم کو گزشتہ ایّام میں اس قدر مہتم بالشّان بنا دیا تھا۔ ان کے خطوط اور حدود ماضی کے دُور دراز دھندلکے میں کھوئے نہیں گئے بلکہ اُنیسویں صدی کے افسردہ اور بلگج رنگوں کے پس منظر میں اور بھی اُجاگر نظر آتے ہیں!

آخر وہ ماضی بھی کس کام کا جو نظر آئے تو آسمان کا تارا بن کر ہی نظر آئے جسے ہم چھو نہ سکیں نہ اس کے دل کا راز لے سکیں نہ اپنا دے سکیں بس دُور سے بیٹھے اس کی پوجا کریں۔ یہ ماضی آخر یہاں کی آب وگل سے تعمیر ہوا تھا اس میں یہیں کا چونا پتھر

کھپا تھا۔ اگر ہمارا مطالعہ کام کا ہے تو یقیناً یہ ہمیں اس چوٹے پتھر کو کارآمد بنانے میں امداد دے گا۔ ہمیں اس پرانے ایوان کی استواری اس کے خطوط کی ہم آہنگی کی طرف رہنمائی کرے گا۔ اس کی درزیں اور اس کی پچی کاری بتا کر رہے گا۔ ہم نے پرانی تعلیم کے مطالعہ میں اسی افادی پہلو کو پیشِ نظر رکھا ہے تو اس بات کا اعتراف ہے کہ ہماری پرانی تعلیم تو ایک دریائے ناپیدا کنار تھی۔ اور اسے سمیٹنا ایک مضمون کے بس کی بات نہیں۔

اس کے بعد نئی تعلیم آتی ہے۔ نئی تعلیم سے ہماری مُراد انگریزی تعلیم نہیں کیونکہ اب تو ہمارے حاکم بھی اس دیس میں اتنے پرانے ہو چلے ہیں کہ لوگ انہیں اور ان کی تعلیم کو پرانے چونے کی طرح اتار دینے کی فکر میں ہیں۔ نئی تعلیم سے ہماری مراد تعلیم کا وہ نیا نظریہ اور عمل ہے جو انسان کو نئی تہذیب اور ایک نئی دُنیا کے لئے تیار کرے۔ یہ نظریہ کہنے کو نیا ہے۔ نئی تہذیب کی نئی قوتوں کی پیداوار ہے۔ لیکن جب ہم اس کا تجزیہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مدت سے کھوئی ہوئی دولت ہمیں دوبارہ مل گئی ہے۔ ہماری پرانی تعلیم اور اس نئی تعلیم میں بعض پہلوؤں سے حیرت انگیز مماثلت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ افراد اور قومیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں، لیکن نسلِ انسانی کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ ماحولی حالات بدلتے رہتے ہیں لیکن انسان، اس کی فطرت، اس کے مسائل اور اس کے محرکات جوں کے توں رہتے ہیں۔ تاریخ انسانی میں اکثر ان مسائل پر نیکی اور محبت، ہمدردی اور سوجھ بوجھ کے ساتھ غور کیا گیا۔ اکثر ان کے حل پیش کیے گئے۔ لیکن ہمیشہ ان کے بنیادی اُصولوں میں ایک حیرت انگیز یکسانیت اور ہم آہنگی پائی گئی۔ افلاطون سے کارل مارکس تک ہم ایک ہی نغمہ کے زیر و بم ایک ہی ترنم کا اُتار چڑھاؤ سنتے چلے آئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمیں زندگی کی اچھی اقدار کو اپنانا اور تعلیم کو صحیح سانچے میں ڈھالنا ہے تو ہمیں ماضی کو پیش نظر رکھ کر آگے بڑھنا ہوگا۔

اس وقت ہمارا دیس ایک سیاسی بحران سے گزر رہا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ غلام قوموں کے پاس لے دے کر سیاست کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے۔ لیکن ہمیں اُمید ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ طوفان بھی سر سے گزر جائے گا اور اس کے بعد پھر وہی پُر سکون فضا اور ساحلِ بحر کی موجوں کا مسلسل نغمہ ہوگا۔ زندگی کا سرودِ ابدی طوفانوں سے نہیں بنتا۔ طوفان تو محض زندگی

تاروں کو چھیڑ دیتے ہیں۔ ان زنجیروں کو جن میں نئی بے پناہ قوتیں جکڑی ہوئی ہیں ڈھیلا کر دیتے ہیں۔ کسی آتش فشاں پہاڑ کے تہِ آب پھٹنے سے نئے جزیرے تو بن سکتے ہیں لیکن نئے برِاعظم لہروں کی پیہم جستجو اور مسلسل آرزو سے تیار ہوتے ہیں۔ اس پیہم جستجو کو اُبھارنے، اسے ڈھالنے اور بنانے کے لئے تعلیم کے عمل ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔

مغرب کے سر پہ ایک طوفان آیا اور نکل گیا۔ اس کے سیاہ اور خوفناک بادل چھٹ گئے ہیں۔ اور اُمید کے سورج کی روشنی اُن میں سے چھن چھن کر پڑنے لگی ہے۔ اس کی بدلتی ہوئی دھوپ چھاؤں میں قومیں پھر ایک مرتبہ مصروف کار ہو گئی ہیں وہ زندگی کو بُری بھلی طرح گزارنے کے فکر میں نہیں اسے از سرِ نو تعمیر کرنے کی دُھن میں ہیں۔ لیکن ایک معنی خیز بات یہ ہے کہ ان کے پُرانے ملبے میں سے پہلے پہل کارخانوں کی عمارتیں اُبھرتی نظر نہیں آتیں۔ ان کی جگہ مدرسوں اور یونیورسٹیوں نے لے لی ہے۔

ہمارے ہاں ابھی تک سیاسی بادل اُمنڈے ہوئے ہیں ایک نہ ایک دن یہ بھی صاف ہو کر رہیں گے، تب ہم

بھی حقیقت کی روشنی میں زندگی کے بڑے مسائل کو آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھ سکیں گے اور ان کے حل کی طرف متوجہ ہوں گے۔

آج کل ہمارے ملک میں بھی آئے دن تعلیمی کمیٹیاں بنتی رہتی ہیں ان کی اسکیمیں اور تجویزیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی ان کے پیش کرنے والے حکومت کے کارندے ہوتے ہیں کبھی سیاسئین۔ کبھی مفکرین۔ تعلیمی مسائل میں دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ ہر کس و ناکس اپنا بہترین سرمایۂ فکر اس تعمیری کام پر لگا دینا چاہتا ہے۔ لیکن تعلیم محض فکری نظام کا نام نہیں اس میں تعمیر و تکمیل کا کام بھی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے اکثر تعلیمی خواب کثرت تعبیر سے پریشان ہو جاتے ہیں کثرت تدبیر کے شرمندہ احسان نہیں ہوتے۔

ایک کارخانے کے پیداواری عمل کے لئے ہمیں کارخانہ دار کا نقطۂ نگاہ معلوم ہے۔ انجنیر کے زاویۂ نگاہ سے آگاہی ہے۔ ماہر معاشیات کے مطمح نظر سے بھی واقفیت ہے۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور نقطۂ نگاہ ہے جو سرمایہ اور مشین کے نیچے دب کر رہ گیا ہے۔ وہ ہے مزدور کا نقطۂ نگاہ۔ اسی طرح تعلیم میں ہمیں مفکرین عظام کا نظریہ معلوم ہے ہمیں قائدین کرام کے خیالات کا پتہ ہے۔ حکامِ بالادست کے اشارات اور احکامات بھی یاد ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کاروبار کے مزدور یعنی استاد کے نقطۂ نظر کا کچھ علم نہیں۔ اسی نقطۂ نظر کو اس مجموعے میں پیش کرنے

کی کوشش کی گئی ہے۔

ممکن ہے آپ کو اس نقطۂ نظر سے دلچسپی ہو اور اگر نہیں تو اس بدلتے ہوئے تمدّن میں جہاں اجارہ داری آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے آپ کو استاد کا نقطۂ نگاہ بھی سمجھنا ہوگا۔ آپ تعلیمی کارکن کے حقوق کے تحفّظ کو شاید نظر انداز کر سکتے ہیں لیکن خود تعلیمی عمل کے تحفظ سے اس کے ہمہ گیر اور شدید نقاصنوں سے اغماض نہیں کر سکتے۔ استاد کا یہ مطالبہ کسی ٹریڈ یونین کی مانگ نہیں بلکہ خود تعلیم کا مطالبہ ہے۔ آپ اس کے نقطۂ نگاہ کو سمجھے بغیر تعلیم کے مطمح نظر کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔

ان مضامین میں آپ کو کہیں اس کے دھندلے اور کہیں زیادہ واضح نقوش ملیں گے۔ اگر انھیں پڑھ کر آپ کے دل میں اس کے نقطۂ نظر سے دلچسپی پیدا ہو جائے اور اس ٹوٹے ہارے کارکن کے لئے جو نہایت یاس انگیز حالات میں اسے کامیاب بنانا چاہتا ہے جذبۂ ہمدردی اُبھر آئے تو اس کتاب کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ یہ ہمدردی استاد کے لئے ایک اچھے مستقبل کی ضامن ہی نہیں ہوگی بلکہ زندگی کے لئے ایک نئے مستقبل کی بھی۔

عبدالغفور چودھری
علی گڑھ

پچھلی صدی میں دیسی تعلیم کی کہانی

لوگ کہتے ہیں ہم ترقی کر رہے ہیں ہم تعلیمی لحاظ سے بھی ترقی کر رہے ہیں اور
ترقی تو آخر کار ترقی ہے۔ آگے بڑھنا آگے بڑھنا ہی ہے خواہ یہ آگے بڑھنا [illegible]
کیچڑ میں سلسلاتے ہوئے کیڑے کا ہو یا ایک فضا میں پیرنے والے شاہین کا۔
ہم تعلیمی لحاظ سے آگے بڑھ رہے ہیں اور اگر اسی رفتار سے آگے بڑھتے چلے [illegible] تو
چند سات سو سال کے اندر اندر ہم سو فیصدی خواندگی حاصل کر لیں گے

مگر جب ہم انیسویں صدی کے پہلے نصف کے تعلیمی اعداد و شمار جانچتے
ہیں تو ہمیں اپنی اس "شاندار" تعلیمی رفتار پر کچھ شبہ سا ہونے لگتا ہے معلوم ہوتا ہے
شاید ابن خلدون کے تاریخی نظریے کے زیر اثر ہم ایک آدھ [illegible] سے گزر
گئے ہیں یا شاید ہماری قسمت یونانی قصے کے اس [illegible] کی سی ہے جسے
[illegible] میں جھونک دیا گیا تھا [illegible] ایک

پتھر کو پہاڑ کی چوٹی تک اُٹھا کر لے جائے اور پھر وہ پتھر چھوٹ کر دوبارہ نیچے وادی میں جا گرے۔ اور اس طرح اس کی یہ سزا مسلسل جاری رہے۔

صاحب اقبال قوموں کے پاس محکوم کو ایک جھوٹی نیند سلا دینے کے بہت سے ذرائع ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک نہایت کامیاب ذریعہ اعداد و شمار بھی ہے۔

حکومت کی جانب سے ہر دسویں سال کی مردم شماری کے بعد ہمیں بتا دیا جاتا ہے کہ ہم تعلیمی لحاظ سے ترقی کر رہے ہیں۔ خواندگان کی تعداد بظاہر بڑھتی جا رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ ۱۸۸۱ء میں ہم محض تین فی صدی لکھے پڑھے تھے۔ اور آج چودہ فی صدی کے قریب ہیں۔ یہ اعداد و شمار کی فراہمی کوئی نئی بات نہیں اس سے پہلے بھی تعلیمی اعداد و شمار مہیا کئے جاتے تھے۔ یہ اعداد کسی غیر ذمہ دار ہستی کے فراہم کئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ خود حکومت کے ذمہ دار افسروں کے مہیا کئے ہوئے ہیں۔ ان میں سر ٹامس رو اور ایلفنسٹن جیسی معتبر اور حکومت کے نزدیک مقتدر ہستیوں کے نام شامل ہیں مناسب یہ ہو گا کہ میں آپ کے سامنے صوبہ دار تعلیمی ترقی کے کچھ اعداد و شمار پیش کر دوں۔

پنجاب

پنجاب کی دیسی تعلیم کی داستان سنانے والا نہیں۔ اس کا مرثیہ خوان

س کی بے وقت موت پر نوحہ کہنے والا کوئی ہندوستانی نہ تھا بلکہ ہنگری کا
ندہ تھا وہ اُن مغربی لوگوں میں سے نہیں تھا جن کے خیال میں ہندوستان
پیڑوں سے ہُن برستا ہے جس کو موقع ملے یہاں سے چاندی سونے کے
بٹ سمیٹ لے اس کی نظر میں ہندوستان بڑا دولت مند ملک تھا مگر اس کی
لت ہیرے اور الماس نہیں تھے اس کے علم و ہنر کے خزانے تھے۔

اس موقع پر ڈاکٹر لائٹنر کا مختصر سا تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے
مضمون میں اس کی کتاب سے جگہ جگہ اقتباسات لئے گئے ہیں اور دیسی
لیم کے اُصولوں اور اس کے نتائج کو جانچنے اور پرکھنے میں کسی ماہر تعلیم
تا اس کی سی وسعت نظر کا ثبوت نہیں دیا۔

ڈاکٹر لائٹنر پنجاب کے تعلیمی محکمہ میں بہت ممتاز عہدوں پر مامور
ہا اُس زمانے میں محکمہ تعلیم کی اعلیٰ اسامیاں ہندوستانیوں کے لئے شجر ممنوعہ
ن خصوصاً دو سب سے ذمہ دار عہدے یعنی گورنمنٹ کالج کی پرنسپلی
کہ محکمہ تعلیمات کی ڈائرکٹری لیکن ڈاکٹر لائٹنر کو ان دونوں کا بڑا تلخ تجربہ ہوا
دیا تھا ایک اچھا خاصا پرانا مال گودام تھا جس کے افسر اعلیٰ ایک زمانہ
ایسے فوجی افسر ہوتے چلے آئے تھے جو اکثر فوجی ملازمت میں ناکام
تھے مثلاً میجر آرنلڈ کپتان فلر۔ کرنل ہالرائیڈ وغیرہ لائٹنر ان لوگوں
الاہت کچھ مختلف تھا وہ انگلستان کا نہیں ہنگری کا باشندہ تھا۔ (ورنل)

زندگی ہی سے اُسے مختلف قوموں کو دیکھنے اور ان کے تمدن کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا اس میں وہ نگاہ کی کمی نہیں تھی جو بسا اوقات ایک چھوٹے سے جزیرہ کے رہنے والوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک برِاعظم کا رہنے والا تھا۔ اس کی نگاہ میں کلچرل وسعتیں موجود تھیں۔ اس کا دل ایک اتھاہ ساگر کی مانند تھا جس میں سینکڑوں دریا آکر گرتے ہوں اور یوں گھل مل جاتے ہوں کہ پتہ نہیں چلتا کس کا پانی کہاں ہے۔

اس نے اوائل عمر میں مسلمانوں کے مکتبوں میں تعلیم پائی تھی۔ ان اداروں میں اُس نے کچھ ایسی اقدار حاصل کیں جنہیں وہ عمر بھر سینے سے لگائے رہا۔ اور جب ہزاروں میل سمندر پار وہ ایک اجنبی دیس میں پہنچا تو اس نے یہاں ایک مرتبہ پھر اسی نظام تعلیم کو دیکھا جس نے ... سے یہ اقدار بخشی تھیں لیکن اب اس نظام میں حیات بخشی کی صلاحیتیں نہ رہی تھیں وہ تو خود ہی ایک سسکتا دم توڑتا ہوا نظام تھا۔ جو سکرات کی حالت میں تھا۔ اس کیفیت سے اس کے دل پر چوٹ لگی اور اس نے اپنے تاثرات کو ایک رپورٹ کی صورت میں قلمبند کیا جو اس نے ۱۸۸۲ء کے کمیشن کے سامنے پیش کی۔

ایک غیر قوم کی تعلیم کا صحیح جائزہ ایک اجنبی دیس کا رہنے والا اسی وقت کر سکتا ہے جب ذہنی لحاظ سے وہ اپنے آپ کو اس قوم سے اتنا ہم آہنگ کر دے کہ وہ ان کے ساتھ ایک دل دو قالب ہو جائے۔ اس مفاہمت

کے لئے ضروری ہے کہ اُس میں وہ علمی قابلیت موجود ہو جو دوسروں کے علم کو اپنا لے یا اس میں تخیل کی وہ پرواز ہو جو اسے فروعی جزئیات کی دلدل سے نکال کر ایک ایسی فضا میں پہنچا دے جہاں وہ قوم اور رنگ کی پابندیوں سے بالاتر ہو جائے۔ یا پھر اس میں ہمدردی ہو وہ ہمدردی جو باوجود علمی کمزوریوں تخیل کی پستیوں اور ذہنی پابندیوں کے حقیقت کو پا سکتی ہے۔ جسے اقبال عشق کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ لائٹنر میں جہاں عقل تھی وہاں عشق بھی تھا۔ علمی لحاظ سے اس کا پایہ بہت بلند تھا۔ وہ لندن کے کنگز کالج میں پروفیسر تھا اس کے ساتھ ساتھ وہ مشرقیات کا بڑا عالم تھا۔

ڈاکٹر لائٹنر کے الفاظ میں "مشرقی زندگی کا ایک خوشگوار پہلو یہ رہا ہے کہ علم کی قدر کی جائے اور پنجاب بھی اس مسلمہ سے مستثنیٰ نہ تھا۔ اگرچہ یہ صوبہ خانہ جنگیوں اور بیرونی حملوں کی خاص طور پر آماجگاہ رہا لیکن پھر بھی تعلیمی اوقاف ہمیشہ محفوظ رہے۔ بلکہ کچھ نہ کچھ بڑھتے ہی رہے۔ بے باک سردار بھی جنہیں ڈاکو اور لٹیرے تک مدرسے قائم کرتے تھے اور اہل علم کی خدمت بھی نذر عقیدت پیش کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ اپنے ضمیر کے زخموں پر ایک پھاہا لگا سکتے ہیں اور اسے سکون پہنچا سکتے ہیں چھوٹے زمینداروں کا بھی یہی حال تھا۔ کوئی مسجد، مندر یا دھرم شالہ مکتب سے خالی نہ تھا۔ ان مکتبوں میں چھوٹے اور بڑے سب ہی مذہبی تعلیم کے لیے جوق در جوق آتے تھے

ملک بھر میں دولتمندوں کے طبقے میں بہت کم آدمی ایسے تھے جو بچوں کی تعلیم کے لیۓ ایک مولوی پنڈت یا گرو نہ رکھتے ہوں ان کے بچوں کے ساتھ ان کے دوستوں اور شاگردوں کے بچے بھی پڑھتے تھے۔ ان کے علاوہ ہزاروں مدرسے ایسے تھے جن کا کسی عبادت گاہ سے تعلق نہ تھا ان ہندو مسلمان سکھ سبھی جاتے تھے اور ان میں فارسی دیوناگری۔ اور ہندی کی تعلیم ہوتی تھی پھر سینکڑوں اہل علم ایسے بھی تھے جو اپنے ہم مذہب لوگوں کو بلکہ اور لوگوں کو بھی فی سبیل اللہ پڑھاتے تھے۔ ملک بھر میں ایک بھی دیہ ایسا نہ تھا جو اپنی آمدنی کا کچھ حصہ کسی اہل علم کی خدمت میں پیش کرنے میں محسوس نہ کرتا ہو۔

مسلمانوں کے معزز خاندانوں میں خاوند اپنی بیویوں کو پڑھاتے تھے اور یہ بیگمات اپنے بچوں کو تعلیم دیتی تھیں۔ قصہ مختصر اگر ہم طلباء کی تعداد سے کم بھی شمار کریں تو صوبہ بھر میں تین لاکھ تیس ہزار طلباء تھے۔ اور آج ۱۸۸۲ء میں تو ایک لاکھ نوے ہزار سے کچھ ہی زیادہ ہیں۔ ان اداروں میں بچے لکھنا پڑھنا سیکھتے تھے۔ اس کے ساتھ تھوڑا سا حساب بھی۔

ان کے علاوہ ہزاروں طلبا عربی مدرسوں میں اور سنسکرت پاٹھ شالاؤں میں پڑھتے تھے جن میں مشرقی ادب اور قانون منطق۔ فلسفہ اور طب کی اعلیٰ درجے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور دسیوں ہزار طلباء فارسی میں

صل کرتے تھے یہ استعداد آجکل حکومت اور امدادی سکولوں کا تو کیا ذکر ہے
لج کے طلبا میں بھی نہیں پائی جاتی۔ ان تمام اداروں میں تعلیم مقصود بالذات
ں۔ ان میں ایک ایسی روح، ایک ایسا جوش اور ولولہ کام کر رہا تھا جس کے
یا اثر علم علم کے لئے حاصل کیا جاتا ہے یا ان اثرات کی خاطر جو انسان کی سیرت
ر مذہبی کلچر کو ڈھالتے اور بناتے ہیں۔ بنیوں کے لڑکے بھی جو تعلیم کو محض روزی
انے کا ذریعہ سمجھتے ہیں اپنے ان غریب پاندھوں کو جو انھیں حساب اور منیمی
کھاتے ہیں ایسی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جیسے وہ دیوتا سروپ ہوں"
پنجاب کے اعداد کے سلسلے میں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ وہاں آج
ں ابتدائی مدارس کی تعداد چھ ہزار سے کچھ ہی اوپر ہے اور طلبا ہوتے تین
کھ ہیں۔ لائٹنر کے خیال میں فتح پنجاب سے پہلے وہاں مکتبوں کی تعداد تین
زار کے قریب تھی۔

یوپی

پنجاب کی طرح دوسرے صوبوں میں بھی ایسے نیک اور ہمدرد افسر
ے جنھوں نے تعلیمی اعداد و شمار کا سچا اور گہرا جائزہ لیا۔ یوپی میں اُس زمانہ
ے پورے صوبہ کے اعداد و شمار تو ہمارے پاس موجود نہیں اور سچ پوچھئے تو
ری ۱۸۷۲ء کی مردم شماری بھی تفصیلی اعداد مہیا نہیں کرتی لیکن انفرادی طور

پر بعض ضلعوں کے متعلق افسروں نے تحقیقات کی۔ ان کے نتائج ہمارے پاس موجود ہیں۔ مسٹر فریزر نے جو پچھلی صدی کے پہلے نصف میں گوڑ گاؤں کے کلکٹر تھے ضلع میں لکھے پڑھوں کی تعداد کا جائزہ لیا تھا۔ ان کے خیال میں لکھے پڑھوں کی تعداد اس ضلع میں ۱۰ فی صدی تھی۔ گوڑ گاؤں آج تعلیم کے لحاظ سے پنجاب کے پس ماندہ ضلعوں میں سے ہے۔ اس زمانہ میں یہ ضلع یوپی میں شامل تھا۔ فریزر نے دہلی اور اس کے مضافات میں تعلیم عوام کی تحریک چلائی تھی جسے وہ ایک مدت تک دو سو روپیہ ماہوار اپنی گرہ سے خرچ کر کے چلاتے رہے لیکن جب کلکتہ کی مرکزی حکومت سے امداد کی درخواست کی گئی تو اس بنا پر مسترد ہوئی کہ حکومت تعلیم کے کام کو اتنا پھیلانا نہیں چاہتی کیونکہ ان کاموں کے لئے حکومت کے پاس روپیہ نہیں۔

بنگال

اسی طرح بنگال میں سول سروس کے ایک رکن مسٹر ایڈم تھے۔ انھیں ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ کی حکومت نے بنگال کے دیسی مکاتیب کی تحقیقات کرنے پر مامور کیا۔ یہ پہلے ایک عیسائی پادری تھے اور چونکہ انھوں نے تثلیث کا عقیدہ چھوڑ دیا تھا اور توحیدی عیسائیت کو اختیار کر لیا تھا۔ اس لئے اُن کے ہم وطن اکثر انھیں Wallah Adam حق کہتے تھے۔

ایڈم کے الفاظ میں صوبہ بھر میں کوئی گاؤں یا شہر ایسا نہ تھا،
جس میں کوئی تعلیم گاہ موجود نہ ہو اس حساب سے مکتبوں کی تعداد
۲۸۸۷۹ ہوتی ہے۔ اگر ہم فی مکتب دس طلبا بھی فرض کریں تو طلبا کی
مجموعی تعداد تین لاکھ ہوتی ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ اصل تعداد اس سے کہیں
زیادہ تھی۔ ایڈم نے ایک لاکھ مکتبوں کا اندازہ ایک مسودے کی بنا پر قائم کیا
تھا جو کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن کے ایک معزز و معروف ممبر کا لکھا ہوا تھا

حکومت نے مدرسوں کی اعداد شماری تو کی نہیں تھی نہ اسے
اس کی ضرورت تھی ہاں تعلیمی بجٹ کی پائی پائی پر اس کی نگاہ تھی اور بجٹ
کے اعداد و شمار سے ایڈم نے مدرسوں کی تعداد کا اندازہ لگایا اس مسودے
کی رُو سے اگر حکومت فی مکتب ایک روپیہ ماہانہ زر امدادی دے تو اسے
ہر سال بارہ لاکھ روپیہ خرچ کرنا پڑتا تھا اس حساب سے بنگال بھر میں ایک
لاکھ مکتب ہوئے، ویسے اس زمانے میں گاؤں کی تعداد اس صوبے میں
ڈیڑھ لاکھ کے قریب تھی اور اگر ہر گاؤں میں ایک مکتب کی موجودگی تسلیم
کر لی جائے تب بھی ان کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے کم نہ ہو گی۔

مدراس

سر ٹامس منرو نے ۱۸۲۶ء میں ایک رپورٹ مدراس کے

دیسی مکاتب کی حالت پر لکھی تھی۔ اس نے اپنا مسودہ صوبہ کے مختلف ضلعوں کی رپورٹوں سے تیار کیا تھا۔ اس کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں نجی طور پر گھروں میں تعلیم بہت دی جاتی تھی۔ خاص مدراس کے شہر میں ایسے طلبار کی تعداد جو گھر پر تعلیم پاتے تھے ان طلبار کی نسبت جو مدرسہ جاتے تھے پانچ گنی تھی۔ ان کے اپنے الفاظ میں "شاید نجی طور پر تعلیم پانے والے طلبار کی تعداد اتنی زیادہ نہ ہو لیکن بہت کافی تھی کیونکہ ملک کے اس حصہ میں یہ عام رواج ہے کہ بچوں کو نجی طور پر اُستاد یا ان کے والدین گھر پر تعلیم دیتے ہیں"۔ اس اقتباس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس دور کے تعلیمی اعداد و شمار سے تعلیمی ترقی کا کم سے کم اندازہ ملتا ہے۔ اور درحقیقت پڑھے لکھوں کی اصل تعداد یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہوگی جو حکومت کے افسران نے دی ہے۔ یوں بھی چونکہ بیشتر طلبار نجی طور پر تعلیم پاتے تھے اس لئے ان کی تعداد کا صحیح طور پر تعین کرنا آسان کام نہ تھا۔ منرو کے قول کے مطابق صوبہ مدراس میں تعداد خواندگان مختلف طبقوں میں مختلف تھی۔ بعض میں سو فی صدی خواندگی موجود تھی۔ اور بعض میں لکھے پڑھوں کی تعداد بمشکل دس فی صدی ہوگی۔ اس پر منرو لکھتا ہے کہ "یہ تعلیمی حالت جو اوپر کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتی ہے۔ ہمارے ملک انگلستان سے تو بدتر ہے مگر دیگر یورپی ممالک کے پچھلے چند سالوں کی تعلیمی اعداد و شمار سے بہت بہتر ہے۔ پہلے

زمانہ میں تو یہ حالت یقیناً اچھی رہی ہو گی لیکن پچھلی صدی کے دوران میں
تعلیمی حالت میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی محض اتنا ہوا کہ آبادی
کے ادھر اُدھر منتقل ہو جانے سے یا جنگ یا دوسری وجوہات سے کہیں مکتبوں
کی تعداد گھٹ گئی اور کہیں بڑھ گئی۔

برما

سنہ ۱۹۱۱ء کی رپورٹ مردم شماری میں برما پر ان الفاظ میں تبصرہ
کیا گیا ہے "برما عام لوگوں کی تعلیم کے معاملہ میں ہندوستان کے دوسرے
صوبوں سے بہت اُونچا ہے۔ اس کی وجہ وہ مُفت تعلیم ہے جو وہاں کی
مذہبی خانقاہوں میں دی جاتی ہے"۔ برما میں لکھے پڑھوں کی تعداد ۳۶
فی صدی سے کچھ زیادہ ہے۔ برما میں دیسی اخبارات کی اشاعت ہندوستانی
اخبارات سے کہیں زیادہ ہے اور پچھلے دنوں عوام کی تحریکات میں جو
اس قدر ولولہ اور جوش پایا گیا وہ سب اسی عام تعلیم کی وجہ سے تھا۔ برما
میں تعدادِ خواندگان کی اس زیادتی کا تذکرہ ورنیکلر ایجوکیشن کمیٹی برما سنہ ۱۹۳۶ء نے
بھی کیا ہے سنہ ۱۹۲۱ء میں ان مکتبوں کی تعداد ۱۷۵۲۶ تھی مگر ستر سال سے
زیادہ حکومت کرنے کے بعد بھی گورنمنٹ کوئی ایسا نظام تشکیل نہیں کر سکی
جس میں ان دیسی مدارس کو مناسب جگہ مل سکے۔ برما کے مکتب بدھمت

کے سادھوؤں کی ہمت اور قربانی کے بل پر چل رہے ہیں اوقاف کے سہارے نہیں چل رہے کیونکہ ان خانقاہوں کے لئے کوئی اوقاف نہیں۔ بھکشو گاؤں کی پھیری کرتے ہیں نذر نذرانہ لیتے ہیں اور اسی سے اپنا گزارا چلاتے ہیں۔

لڈلو (ludlow) کی کتاب برٹش انڈیا کے مفصلہ ذیل اقتباس سے پورے ہندوستان کی دیسی تعلیم کے متعلق کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

لڈلو مدرس کو گاؤں کا ایک باقاعدہ ملازم قرار دیتا ہے ہر ہندوستانی گاؤں میں جہاں پرانا سماجی نظام تھوڑا بہت بھی محفوظ ہے علم کے ابتدائی مدارج شوق سے طے کئے جاتے ہیں۔ گاؤں بھر میں شودروں کے سوا جنھیں دیہاتی سماج میں شمار نہیں کیا جاتا، ایک بچہ بھی ایسا نہیں ملتا جو لکھ پڑھ نہ سکتا ہو یا تھوڑا بہت حساب نہ جانتا ہو۔ اور حساب میں تو یہ بچے خاص طور سے بڑے ہوشیار ہوتے تھے۔ لڈلو (ludlow) کے اپنے الفاظ میں "اب تو یہ حالت ہے کہ ہر جگہ مدرس تو غائب ہو گیا ہے لیکن اس کے نام کی وقف زمین اس کے فرائض کی یاد کو تازہ کئے ہوئے ہے۔ گاؤں کے کاغذات میں مدرس کا مکتب اور چوکیدار کی زمین ابھی تک درج ہے۔ اور جب کبھی ان زمینوں کو ان کے اصلی مقصد کے لئے حکومت نے واپس دے دیا ہے تو لوگوں نے اس پر خوشنودی کا اظہار کیا۔

دیسی مکتب اور ان کے اساسی اُصول

لائیٹنر قرآنی مدارس کے متعلق لکھتا ہے "جب ہمیں خیال آتا ہے کہ یورپ کے غربا کا بیشتر حصّہ کیسی بے کیف زندگی گزار رہا ہے۔ خدا سے دور اور علم سے بے بہرہ زندگی! تو ہمارے دل میں رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ کاش یورپ میں انجیل پڑھانے کے مدرسے جو حقیقی طور پر عوام کی روزمرّہ زندگی اور ان کی روایات سے وابستہ ہیں جن میں ان کے تہوار منائے جاتے ہیں جن کی تقدیس، حبّ وطنی، مذہب اور ادائے فرض کی قسموں سے کی جاتی ہے، ایک دن یورپ میں حقیقی تعلیم کا وہی فرض انجام دے سکیں جو پنجاب کے قرآنی مدارس اس غربت اور افلاس کی حالت میں پورا کر رہے ہیں"

ادائیگی فیس کے مسئلے پر لائیٹنر لکھتا ہے "ان فارسی مکتبوں یا قرآنی مدارس میں فیس کی ادائیگی یا ایک تحفہ کا پیش کرنا بھی اس ادب سے کیا جاتا ہے جو اسے محض جلبِ منفعت اور لالچ کی سطح سے بہت اونچا اٹھا لیتا ہے ان اداروں میں یہ چیز بہت بلند ہو جاتی ہے۔ مثلاً عید کے تہوار پر استاد کی خدمت میں عیدی پیش کرنے کے سلسلے میں پہلے استاد بچے کو ایک زرافشاں کاغذ پر کچھ شعر لکھ کر دیتا ہے جن کا مضمون اسی موسم یا تہوار کے مطابق ہوتا ہے۔

عیدی کے اشعار جہاں ایک ادبی حیثیت رکھتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ ہندو اور مسلمانوں کے کلچرل اور معاشرتی تعلقات پر بھی دلچسپ روشنی ڈالتے ہیں مثلاً عید تو مسلمانوں کا تہوار ہے اور عیدی عید پر ملنا چاہیے لیکن استاد تو پھر اُستاد ٹھہرے اکیلے عید کی سویوں پر کیسے قناعت کر لیتے۔ انھوں نے ایک عید کی بجائے کئی عیدیں ایجاد کر لیں مثلاً عید بسنت عیدِ دسہرہ وغیرہ ایک عیدی ملاحظہ ہو۔

بسنت آمد کہ سبزاں ہم چو صد برگ　　قبائے زعفرانی کردہ در بر

خراماں کو بکو سر جامہ زیبے　　بکف خنجر بسنتی چہرہ بر سر

لائٹنر اپنے بچپن کے تعلیمی تاثرات کی روشنی میں پنجاب کے قرآنی مدارس پر یوں تبصرہ کرتا ہے۔

"میں نے کچھ تعلیم ایک مکتب میں بھی پائی تھی۔ جہاں میں نے عربی زبان پڑھی اور قرآن کی بہت سی آیتیں حفظ یاد کیں۔ اس نظام تعلیم میں اور ان اخلاقی اور معاشرتی اصولوں میں جو وہاں پڑھائے جاتے ہیں اگرچہ چند ایک خامیاں تھیں لیکن پھر بھی بڑی بڑی خوبیاں موجود تھیں۔ گورنمنٹ کے اسکولوں میں تم ان خوبیوں کو لاکھ ڈھونڈھیں لیکن نہیں پائیں گے"

مہاجنی مکتب

قرآنی اسکولوں کے بعد وہ مہاجنی مکتبوں پر آتا ہے۔

"ان مکتبوں کے طلبا، حساب کے بڑے پیچیدہ سوال اور خاص طور پر اجناس کے بھاؤ اور ان کے اُتار چڑھاؤ کا حساب ایسی پھرتی اور آسانی سے نکالتے ہیں کہ ہمارے ریاضی کے ایم، اے پاس طلبا، کو انھیں دیکھ کر نہ صرف تعجب ہوتا ہے بلکہ اکثر پریشانی بھی ہوتی ہے اگرچہ یہ لوگ سوالوں کو زبانی نہیں بلکہ لکھ کر نکالتے ہیں اور سائنس کے طریق اور ریاضی کے نئے گُروں سے بھی واقف ہوتے ہیں لیکن اس پر بھی دوگنا وقت لگا دیتے ہیں اور مہاجنی مکتبوں کے طلبا، کے مقابلے میں زک اُٹھاتے ہیں۔"

کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ۱۸۲۴ء میں گورنر جنرل بنگال کے نام ایک چھٹی لکھی تھی جس میں انھوں نے ظاہر کیا تھا کہ ہندو، دیسی علم ادب اور ان کے عوام کی ترویج محض بے کار ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہے۔ اس چھٹی کے جواب میں پبلک انسٹرکشن کی کمیٹی نے مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا۔

"سنسکرت اور عربی کی زبان میں جو کتابیں ما بعد الطبیعات پر لکھی گئی ہیں۔ وہ اتنی ہی قابلِ مطالعہ ہیں جتنی کہ اس موضوع پر کسی دوسری زبان کی کتابیں۔ ہندوؤں کا حساب اور الجبرا انھیں اُصولوں پر مبنی ہے جو کہ یورپ میں تسلیم

کیے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے مدرسہ میں ریاضی کے ابتدائی مسائل اقلیدس سے لئے گئے ہیں۔ فقہ جو کہ ان اداروں میں ایک بہت ہی اہم مضمون ہے ملک کی اچھی حکومت کے لئے بے حد ضروری ہے۔ اور زبان تو وہ بنیادی چیز ہے جس پر مستقبل کی تمام ترقیوں کا دارومدار ہے۔"

مسٹر کیمپبل Campbell کلکٹر ضلع بلاری (مدراس) اپنی اس رپورٹ میں جو انھوں نے ۱۸۲۳ء میں لکھی تھی کہتے ہیں کہ دیسی مکتبوں میں بچوں کو لکھنا سکھایا جاتا ہے اور جس کفایت اور تھوڑے خرچ میں یہ کام انجام دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے زیادہ استعداد والے طلبا مبتدیوں کو پڑھانے میں مدد دیتے ہیں اپنے علم کو اور زیادہ مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے میں یہ طریقے بلاشک وشبہ قابل تعریف ہیں اور ولایت میں اس کی جو پیروی کی گئی ہے لائق صد تحسین ہے۔

مکتب اور کنڈر گارٹن

ایڈمز اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰ پر جرمن کے نظام تعلیم اور دیسی مکاتب میں چند ... مماثلت پیش کرتا ہے اس کے خیال میں کنڈر گارٹن طریق تعلیم دونوں نظام میں مشترک ہے۔ اس کے علاوہ اخلاقی اور ذہنی تعلیم کی اہمیت طلبا کا عالمانہ بحث و مباحثہ، ایک نامور استاد سے استفادہ کے بعد دوسرے

اُستاد کی طرف رجوع کرنا فارغ التحصیل طالب علم کو اجازہ کی سند دینے کا رواج ان سب اُمور میں دونوں نظام تعلیم ملتے جلتے ہیں۔

دیسی مکتبوں میں طریق تعلیم اور عام نظم و نسق پر ریورنڈ برک کے خیالات ملاحظہ ہوں جن کا اظہار انھوں نے بنگال میں تعلیمی ہفتہ کے موقعہ پر کیا تھا۔

"قدیم زمانہ کے دیسی مکتبوں میں بعض مفید خصوصیات موجود تھیں اور اگر انھیں دوبارہ زندہ کر کے جدید اسکولوں میں رائج کر دیا جائے تو وہ ضرور کارآمد ثابت ہوں گی۔ اِن مکتبوں میں بعض مضامین کی تدریس، مثلاً لکھنے اور پڑھنے کے سلسلے میں بچہ کی خود فعلیت پر خاصی توجہ دی جاتی تھی۔ اس کے برعکس آج کل کے اسکولوں میں اس کی کمی سب سے نایاب ہے۔ تعلیم انفرادی طور پر دی جاتی تھی اور ایک پوری جماعت کو اکٹھا پڑھانا مستثنیات میں سے تھا ہر بچہ اپنی استعداد کے مطابق سبق لیتا تھا۔ اور اپنی رفتار پر چلتا تھا۔ پرانے مکتبوں میں لکھنا پڑھنا سکھانے کا طریق یورپ کے جدید طریق تعلیم سے حیرت انگیز مماثلت رکھتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ نے یہی طریقے دوبارہ ڈھونڈھ نکالے ہیں"۔ اس کے بعد انھوں نے دیسی مکاتب کے طریق تعلیم سے چند مثالیں دے کر اپنے دعویٰ کو ثابت کیا ہے۔

دیسی مکتبوں کے ولایت پر تعلیمی احسانات

آج تو ہم ہر چیز مغرب سے اُدھار لینا فخر سمجھتے ہیں - اپنایا نہیں جاسکتا۔ جو تعلیمی اُصول لندن کا بورڈ آف ایجوکیشن ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہے۔ یہاں چند سال کے بعد بطور الہامات پیش کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان الہامات کا پہچاننے والا پچھلے سال ہی تو ولایت گیا تھا۔ اور وہ پچھلے سال کے اُصول ہی ہم پر عائد کرسکتا ہے۔ بعینہ اسی طرح جیسے کہ ہمارے ہزارہا ہم وطن جاڑوں کے موسم میں اہل مغرب کے اُترے ہوئے کوٹ پہنتے ہیں اور اکثر اس انداز سے پہنتے ہیں گویا خاص طور پر انھیں کے لئے سل کر آئے ہیں اسی طرح ہمارے ماہرین تعلیم ولایت کی شریف تعلیم کو اپنے بے ڈول جسم پر راست سمجھتے ہیں۔ اُدھار لینے کے مسئلہ پر ماہرین تعلیم اور بازاری آدمی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس مسئلے میں ٹامس منرو کا ایک جملہ قابل اعادہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کلچر اور تمدن تجارتی اجناس کی طرح آپس میں تبادلہ کی جاسکیں اور اس منڈی میں ولایت اور ہندوستان آپس میں سوداگریں تو اس میں شاید ولایت ہندوستان سے کچھ حاصل کرلے گا گھاٹے میں نہیں رہے گا۔ بہر حال جہاں تک اس عہد کا تعلق ہے ولایت نے تعلیمی لحاظ سے ہندوستان سے کچھ نہ کچھ لیا ہے۔ ولایت میں تعلیم عوام کا کام باقاعدگی سے اسی دور میں شروع ہوا

جس کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں اور اس کا علم بردار ڈاکٹر بیل (Bell) تھا۔ اس نے اپنے مشہور مانیٹوریل سسٹم کے ذریعہ سے ولایت میں عام اور سستی تعلیم کا رواج ڈالا۔ یہ طریق تعلیم اس نے ہندوستان سے ہی لیا تھا اور اس کا اعتراف حکومت نے کئی ایک جگہ کیا ہے۔ ہندوستان کا دوسرا احسان یہ تھا کہ یہاں کے آرٹ اور صنعت و حرفت کے شاہ کاروں کو دیکھ کر انگریز دستکاروں میں بھی ایک نیا احساس حسن پیدا ہو گیا۔ انگلستان کا صنعتی فروغ ۱۸۵۱ء کی لندن کی نمائش کے بعد ہوا اس میں ہندوستانی صنعت کا سکشن سب سے زیادہ جاذب نگاہ اور ولایت کے عوام کے لئے سبق آموز تھا۔ لائیٹنر کہتا ہے کہ جیسے ہندوستان کے آرٹ اور صنعت و حرفت کے نادر نمونوں نے انگریز دستکاروں میں ایک صحیح مذاق پیدا کر دیا ہے اسی طرح دیسی مکاتب کے طریق تعلیم نے ولایت کے اسکولوں پر بھی اثر ڈالا ہے۔

دیسی تعلیم میں والدین کا تعاون

ڈاکٹر لائیٹنر بہت واضح اور صحیح طور پر ان خطرات کا تذکرہ کرتا ہے جو مدرسہ اور سماج میں بے تعلقی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ نئے انگریزی اسکولوں کے نصاب کی تشکیل کسی سماجی اور معاشی پس منظر کو سامنے رکھ کر نہیں کی گئی تھی اس لئے ان اداروں کے فارغ التحصیل طلباء کی دلچسپیوں

اور عوام کے مذاق میں ایک اجنبیت سی آگئی۔ اس زمانہ میں عوام ذہنی، اخلاقی اور احساس حسن کے لحاظ سے اک گونہ بیدار تھے ان کے مشاعرے اور مذہبی مجلسیں تذکرۃ الانبیا کے قصے یا آلھا اودل کے گیت پنچایت گھر کی گفتگو اور مقدس مذہبی کتابوں کا ورد یہ سب ہی چیزیں ان کی روزمرہ کی زندگی میں ایک نیا پیام لاتی تھیں لیکن لائٹنر کے خیال میں جہاں کہیں انگریزی مدرسے کا اثر غالب آیا وہاں عوام کی ذہنی زندگی میں یہ اثرات ختم ہو گئے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ سخت خطرہ اور تھا اور وہ یہ کہ نئی طرز کی انگریزی تعلیم میں والدین کے تعاون کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔

نئی حکومت کو عوام کی پرواہ نہ تھی، اور نئی تعلیم کو بھی عوام کی کچھ ایسی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اس تعلیم کے چلانے والوں نے خیال کر لیا تھا کہ وہ ایک سماجی اور معاشی خلا میں بھی ان اداروں کو چلا سکیں گے۔ لیکن ایک نظامِ تعلیم عوام کو نظر انداز کر سکتا ہے لیکن بچوں کے والدین کو نظر انداز کرنا کسی نظامِ تعلیم کے بس کی بات نہیں نئی تعلیم والوں نے انھیں بھی نظر انداز کر دیا۔ لائٹنر کے الفاظ میں "پہلے بچے اپنے سبقوں کو جو اخلاق اور انسانیت سے متعلق تھے گھر پر آ کر سناتے تھے اور والدین بھی ان سے فائدہ اٹھاتے تھے لیکن اب تو بچوں کے سبق محض دنیاوی چیزوں کے متعلق ہو کے رہ گئے ہیں اور علم ذہنی ترقی یا کردار کی تعمیر کے لئے نہیں سکھایا جاتا بلکہ محض حصولِ ملازمت کے لئے پڑھایا جاتا ہے۔ وہ

والدین جنہیں اس مقصد کی ذلالت کا شدید احساس ہے سکول کے سبقوں کے ذریعہ اپنے بچوں کو کسی طرح اخلاقی مسائل ذہن نشین کرا سکتے ہیں دوسری طرف انگریزی اسکول کا طالب علم اپنے والد کی باتوں کا کوئی لحاظ یا عزت نہیں کرتا کیونکہ اب تو وہ اپنے والدین کو جان بوجھ کر حقیر سمجھنے لگا ہے۔

بچہ انگریزی اسکول میں ایسی زبان سیکھتا ہے ایسے جذبات اپناتا ہے جنہیں نہ تو وہ خود اچھی طرح سمجھتا ہے اور نہ ہی اس کے والدین، اس سے نہ اُس کے دل میں کوئی اُونچا جذبہ اُبھرتا ہے اور نہ اس کا اس کی خاندانی روایات یا مذہب سے کوئی واسطہ ہوتا ہے۔ جہاں کہیں بھی بچے کو ایک غیر زبان میں تعلیم دی جاتی ہے بچہ پر والدین کا اچھا اثر زائل ہو جاتا ہے اور جو تربیت اور اخلاق وہ عملی زندگی کے متعلق دیتے ہیں ختم ہو جاتے ہیں۔

انگریزی اسکول کے پڑھے ہوئے سبق بچہ کے گھر میں اس کے بہن بھائیوں تک نہیں پہنچ پاتے۔ اگر یہ تعلیم مادری زبان میں دی جاتی اور اس کی بنیاد بچہ کے معاشی تعلقات اور رشتوں پر رکھی جاتی تو یقیناً اس کا دائرۂ اثر بہت وسیع ہوتا۔

لیکن لائٹنر کی رائے میں دیسی مکاتب کے نظام تعلیم میں والدین کا تعاون اس وقت تک پورے طور پر جاری وساری تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ ابھی تک بہت سے گھرانے ایسے ہیں جن میں بچہ مکتب سے واپسی پر اپنا سبق جو اس

نے پنڈت جی یا مولوی صاحب یا بھائی یا استاد سے پڑھا ہے اپنے والد کو سناتا
ہے اس کا باپ اسے سن کر پھولا نہیں سماتا۔ وہ اُس کے ننھے ننھے علمی کارنامے
پر کہیں نکتہ چینی کہیں ہمت افزائی کرتا ہے۔ بچپن کی یادیں دوبارہ اُبھر آتی ہیں۔
اس کے ذہن میں وہ کہاوتیں حکما کے وہ مقولے تازہ ہو جاتے ہیں جو اُس نے
کبھی بچپن میں سنے تھے وہ ان باتوں کو اپنے بچے کو بھی ذہن نشین کراتا ہے۔
اور علم و مذہب کے اُصولوں اور ان کے عملی پہلوؤں کو زیادہ اُجاگر کرنے کی
کوشش کرتا ہے۔

کتابوں کا شوق

پُرانے نظام تعلیم میں کتابوں کا شوق تھا ہم اس مختصر سے مقالے میں
مسلمانوں کے اس تاریخی شوق کا تفصیلی طور پر تذکرہ کرنا نہیں چاہتے کہ کس طرح
ابن عباد سفر میں اپنا کتب خانہ ساٹھ اُونٹوں پر ہمراہ رکھتا تھا اور بقول ابوالفوا
جاحظ کی وفات ایسے ہوئی کہ وہ کتابوں کے انبار کے نیچے دب کر مر گیا یا یہ
کہ اس شاندار زمانہ میں کتابیں اور نوادر جمع کرنے کا کیسا شوق تھا جس کی بدولت
قرطبہ کے بازار میں ایک ایک کتاب کی کڑی پر دو بولی دینے والوں کے درمیان
باقاعدہ مقابلہ ہوتا تھا وہ تو دور دراز ملکوں کے افسانے ہیں ہم تو آپ کو ایک
ایسے زمانہ کے حالات بتا رہے ہیں جب ایک قوم انحطاط کے انتہائی دور

میں سے گزر رہی تھی جب کتابیں خریدنے یا رکھنے کا تو کیا ذکر روزمرہ کی زندگی
کے منتشر اجزا کو اکٹھا کرنے کی توفیق نہ تھی۔ بڑوں کو تو کتابوں کا شوق ہوتا ہی
ہے ہم آپ کو اس زمانہ کے ایک اسکول کے بچے کا قصہ سناتے ہیں کتابوں
کے شوق میں اکثر لوگوں نے دام تو دئے ہیں لیکن جان نہیں دی اس بچے
نے جان کھو کر ایک کتاب کو پایا تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر ایک مکتب کے بچہ کا ذکر
اپنی رپورٹ میں کرتا ہے، جو سونے کے کپڑے پہنے رہتا تھا قاتل نے بچہ کو
ترغیب دی کہ میرے پاس فارسی خطاطی کا ایک بہترین نمونہ موجود ہے۔
دیکھنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ آؤ اس بہانہ سے اس نے بچہ کو قتل کر دیا۔
اس واقعہ کی عدالتی کارروائی کہیں محفوظ ہوگی اور غالباً لائٹنر نے اسے
ملزم کے اقبالی بیان سے لیا ہوگا۔

کتاب کا احترام

لفٹننٹ گورنر مکلوڈ پنجاب کی رپورٹ میں اس موضوع پر چند دلچسپ
اشارات موجود ہیں "دیسی لوگ دوسری کتابیں بھی ایسی عزت اور حرمت
سے محفوظ رکھتے ہیں جیسے کہ وہ مذہبی کتابوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ انھیں
جزدانوں میں لپیٹ کے رکھتے ہیں لیکن اب جوں جوں چھاپہ کی کتابیں زیادہ
ہوتی جاتی ہیں یہ جذبہ کم ہوتا جا رہا ہے لیکن اس کا اصلی سبب چھاپہ نہیں۔

تبت میں لکڑی کے بلاک کا چھاپہ یورپ سے کہیں پہلے رائج ہو چکا تھا لیکن وہاں اس کے چھپے ہوئے صفحات بھی اسی احتیاط سے رکھے جاتے ہیں۔ جیسے دوسری کتابیں"۔ ہکلوڈ کا خیال ہے کہ مغرب کے طلباء کو کتابوں کا احترام مشرق سے سیکھنا چاہئے۔

نئی تعلیم کی خامیاں

دیسی تعلیم میں کچھ اپنی خوبیاں تھیں کچھ اپنی اقدار تھیں مگر نیا نظام نہ تو پرانی اقدار کو محفوظ رکھ سکتا تھا اور نہ ہی نئی اقدار کی تخلیقی قوت رکھتا تھا۔

لائٹنر اس خامی کا ایک نباض تھا اور اس موضوع پر لکھتے ہوئے اس کے قلم سے وہ اخلاقی غصہ ظاہر ہوتا ہے جو پنجاب کے تعلیمی حالات کو دیکھ کر اس کے دل میں رہ رہ کر اٹھتا تھا لائٹنر پنجاب میں گورنمنٹ کالج لاہور کا پرنسپل ہو کر آیا تھا اس نے شروع شروع میں تعلیمی حالات پر جو تبصرہ کیا ہے اس کے اقتباسات ایک پارلیمنٹ کی رپورٹ میں شائع ہوئے ہیں۔

محکمہ تعلیم اور اس کے ارباب اختیار پر اس کی رائے ملاحظہ ہو یہ اقتباس پارلیمنٹ کی اسی مذکورہ بالا رپورٹ کا ہے "ڈائرکٹر تعلیمات جو محکمہ کا اعلیٰ افسر ہے آج تک یا تو ایک فوجی افسر رہا ہے یا انڈین سول سروس کا ایک رکن اگرچہ ہمارے جاری کردہ نظام تعلیم نے اپنی کمزوریوں اور خامیوں کے

وجود بلا شک بہت کچھ کیا ہے لیکن ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہماری دی ہوئی تعلیم کی ممتاز خصوصیت اس کا کلچر رہا ہے۔ دیسی لوگوں میں جہاں کہیں بھی آپ کو حسنِ مذاق اور نفاست ملے گی وہ یقینی طور پر ایرانی اثر کا نتیجہ ہے۔ صرف مولویوں اور پنڈتوں ہی میں فرضی قابلیت اور علم کا شوق موجود ہے اور انگریزی تعلیم جو ہم دیسیوں کو دے سکے ہیں وہ محض اتنی ہے کہ مختلف علوم کی بہت ہلکی اور سطحی قابلیت اور اس قابلیت کی غیر مہذب اور گستاخانہ طریق پر نمائش ہو جائے۔

آداب معاشری کا انحطاط

آداب معاشری کے انحطاط کے ثبوت میں لائٹنز دو چیزیں پیش کرتا ہے ایک تو پنجاب یونیورسٹی کے کالج کے سینٹ کی تجویز جس کے الفاظ مفصلہ ذیل ہیں "یہ حقیقت ہے کہ گورنمنٹ اسکول دیسیوں کی خود اعتمادی اور اخلاق کو خراب کرتے ہیں اور اس کے بدلے کسی قسم کی مقدس علمی قابلیت تک پیدا نہیں کرتے مختصر یہ کہ بحیثیت ایک حقیقی تعلیمی ادارے کے وہ دیسی مکتبوں سے بہت پیچھے ہیں"۔ دوسرے وہ لفٹنٹ گورنر مکلوڈ کی ایک رپورٹ سے چند اقتباس دیتا ہے "پنجاب میں انگریزی تعلیم کچھ ایسی بہت کامیاب نظر نہیں آتی۔ اس نظام نے علم کا سچا شوق رکھنے والے

کم اور شرفا اس سے بھی کم پیدا کئے ہیں۔ حضور لفٹنٹ گورنر کا منشاء ہے کہ محکمہ اس امر کا خاص انتظام کرے کہ مشرقی طلباء کے وہ اطوار اور اخلاق جو فطرتاً ان میں ودیعت ہوئے ہیں انگریزی سکول میں جاکر برباد نہ ہو جائیں اس مسئلہ سے اب تک بے توجہی برتی گئی ہے اگر اچھے خاندان کے بچوں کو انگریزی اسکول میں بھیجنے کا یہی نتیجہ ہے کہ چھچھورے اور شیخی خورے بن جائیں اور جان بوجھ کر گستاخ اور بے ہودہ ہوں تو پھر کوئی تعجب کی بات نہیں کہ والدین اپنے بچوں کو گھر پر ہی تعلیم دلانا مناسب سمجھیں گے۔

تعلیمی افسروں کی کوششوں کے متعلق جو تخیل کی کمی اور صحیح مقصد کے فقدان کی وجہ سے بے ثمر ہو کر رہ گئیں وہ لکھتا ہے "تعلیمی افسروں کا مطمح نظر اور ان کی بہترین کوششیں اس باب پر مرکوز ہو گئی تھیں کہ وہ بے جُتی زمین میں ان اصلاحات کا بیج بوئیں جن کی کامیابی یورپ میں بھی ایک حد تک مشکوک نگاہوں سے دیکھی جا رہی ہے اس کام میں ان کا وقت تو بہت ضائع ہوتا تھا لیکن نیک نامی بھی ہوتی تھی۔ ہمارے افسروں نے اپنی توجہ ترقی کے ان عناصر پر مبذول نہیں کی جو دیسی تمدن میں پہلے سے موجود تھے اور جنہیں ذہنی طور پر چلا دی جا سکتی تھی اس کا جو نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے۔

انگریزی تعلیم کی اصلی مقاصد سے بیگانگی

جب لائٹنر نے محسوس کیا کہ حکومت اصل مقصدِ تعلیم سے دُور ہٹتی جارہی ہے تو اُس کے تبصروں میں ایک نیا جوش پیدا ہوتا چلا گیا پارلیمنٹری رپورٹ کے ایک اقتباس میں لکھتا ہے "حکومت کے تعلیمی نظام کا عوام پر بہت کم اثر ہے عوام تو گویا ایک غیظ و غضب کے سکتے میں ہیں انہیں احساس ہے کہ ان سے عدم توجہی برتی جارہی ہے اور اُن کے پُرانے تمدن کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے۔"

اس سے متاثر ہوکر اس نے دو تحریکیں چلائیں جن کا اعتراف پارلیمنٹ کی رپورٹ میں بھی ہے ایک تو انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی دوسرے اس کے اثر اور توجہ سے مشرقیات کی تحریک کا آغاز ہوا لیکن ہماری بدقسمتی سے انجمن تو تجویزیں منظور کرنے اور حکومت کی ہر منشا پر صاد کرنے والی انجمن بنی اور تحریک مشرقیات کا بچّہ محض مشرقی علوم کے امتحانوں کی شکل میں ظاہر ہوا۔

لفٹنٹ گورنر مکلوڈ نے ان کی اس تحریک پر کہا تھا کہ یہ اس رجحان کا جس کے ماتحت ہر مشرقی شے کو بلاوجہ بلاسبب مذموم قرار دیا جاتا ہے۔ نہایت خوشگوار ردِّعمل ہے۔

تعلیمی کتابوں کی تالیف و تصنیف

۱۸۱۴ء کے ڈیسپیچ میں جب پہلی مرتبہ ہندوستان کی تعلیم کے لئے ایک لاکھ روپیہ سالانہ منظور ہوا تو اس کا ایک مقصد دیسی ادب کا احیا اور اس کی ترقی متعین کیا گیا۔ ۱۸۲۳ء تک یہ روپیہ جوں کا توں پڑا رہا اور کسی مصرف میں نہ آیا۔ اسی سال کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن بنی اور اس کی زیر نگرانی کتابوں کی تصنیف اور تراجم کا کام شروع ہوا اور آج تک ہر صوبجاتی محکمہ اپنی سالانہ رپورٹ میں ضرور کہیں نہ کہیں تصنیف و تالیف کی کارگزاریاں بیان کرتا ہے لیکن اس کام میں نہ تو کوئی تخلیقی تخیل کارفرما تھا نہ کوئی افادی مقصد۔ اور پھر دیسی ادب پر افسر لوگ جو غیر متوازن تنقید کرتے رہتے تھے اس کی ایک مثال میکالے کا مشہور بیان ہی ہے جہاں تک تخلیقی ادب کا تعلق ہے لائٹنر کے خیال میں دیسی لوگ معذور تھے اکثر حکام اعتراض کرتے تھے کہ یہ لوگ تو شاعری اور وہ بھی عشقیہ شاعری کے سوا کچھ جانتے ہی نہیں اس کا جواب لائٹنر یوں دیتا ہے "اب تو دیسی لوگ پریم کے گیت گاتے ہیں نوجوان اور شاعر مزاج لوگوں کے لئے تو یہ فطری چیز ہے۔ اس رجحان کی اور وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے دیسی شاعر کے لئے اس کے سوا اور موضوع بھی تو نہیں چھوڑا بھلا جن کا مذہب اور جن کی پرانی روایات ختم کردی

گئی ہوں وہ کس منھ سے حُبّ الوطنی کے گیت گائیں گے"۔

ادھر محکمہ کے جو لوگ تالیف و تصنیف کے کام میں صاحبِ اختیار تھے صحیح ادبی ذوق اور وسعت نگاہ سے عاری تھے اس کا تجربہ گارساں ڈی تاسی کو بھی ہوا وہ اپنے خطبات میں کہتا ہے۔

"حضرات میں یقین کرتا ہوں کہ آپ لوگ ہندوستان کے اس انگریز حاکم کی رائے سے اتفاق نہ کریں گے جو اپنی رپورٹ مفصلہ ۲۳ ستمبر ۱۸۵۴ء میں ان کتابوں کا اور خاص کر باغ و بہار۔ گل بکاؤلی۔ اخلاق جلالی۔ زبدۃ الخیال۔ پریم ساگر اور راج نیتی کا (جو میری رائے میں ہندوستانی ادب میں بہت نفیس کتابیں ہیں) نہایت حقارت سے ذکر کرتا ہے۔ اور انھیں بچوں کا کھیل سمجھتا ہے جن سے دل و دماغ میں ہرگز اعلیٰ اور شریفانہ خیالات پیدا نہیں ہو سکتے۔

یہ انگریز مصنف آگے چل کر کہتا ہے کہ راج نیتی کے پڑھنے سے دماغ پر وہی اثر ہوتا ہے جو ایک مدہوش شرابی کو دیکھ کر ہو سکتا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ کتاب ہت اپدیش کا ہندی ترجمہ ہے جس کی فضیلت کا ہر شخص معترف ہے۔ اس انگریز کا خیال ہے کہ ہندوستانی ادب کو انگریزی زبان کے ترجموں سے نیا جسم لینا چاہیے۔ غالباً وہ بھولتا ہے کہ انھیں کتابوں میں بعض اس قدر دلچسپ ہیں اور یورپ میں انھیں اس قدر مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی کہ

خالص یورپی کتابیں بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں مثال کے طور پر میں صرف الف لیلیٰ کا نام لیتا ہوں یہ دُنیا کی نہایت دلچسپ کتابوں میں سے ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ اس سے ہمیں مسلمانوں کے رسم و رواج کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ کتاب محض تفنن طبع کے لئے ہے لیکن کم از کم گلیور کے سفرنامے سے یقیناً کہیں زیادہ قابل وقعت ہے۔"

اعتراف گناہ

افسروں میں سب ہی قسم کے انسان ہوتے ہیں، اچھے اور بُرے ہمدرد اور غیر ہمدرد، بعض اچھے افسران کو اس امر کا شدید احساس تھا کہ انگریزی تعلیم کی بنیاد تعلیم کے سچے اُصولوں پر نہیں رکھی گئی۔ یہ اس عہد کے لوگ تھے اور انھوں نے یہ رائے حالات کے گہرے مطالعہ کے بعد دی ہے۔

الفنسٹن گورنر بمبئی نے ۱۸۲۳ء میں بمبئی کی تعلیمی حالت پر ایک منٹ لکھا تھا اسے دیسی علوم کے انحطاط کا شدید احساس تھا اور وہ اس گناہ کا کفارہ کسی نہ کسی طریق پر ادا کرنا چاہتا تھا وہ لکھتا ہے کہ "ہماری حکومت پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم نے مشرقی سلطنتوں کو تباہ کر دیا، ہم نے ان تمام ذرائع کو مسدود کر دیا جن سے ملک کی شان و شوکت دوبالا ہوتی ہے اور اس کے بدلے میں ہم نے ایک بھی کارِ نمایاں نہ کیا۔ شان و شوکت

گا نہ عوام کے فائدہ کا۔ انصاف کی بات تو یہی ہے کہ ہم نے دیسیوں کی
قابلیت کے سرچشمہ کو خشک کر دیا اور ہماری فتح کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ علم و
ہنر کی ترقی اور شوق ختم ہو گیا بلکہ خطرہ ہے کہ ان لوگوں کے علوم ویسے ہی
ختم نہ ہو جائیں اور وہ عہدِ ماضی کے بلند پایہ مصنفین کی چیزوں کو بھی نہ
بھول جائیں اس الزام کو دُور کرنے کے لئے ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے"۔

ڈاکٹر لائٹنر اپنی کتاب کا آغاز اس المیہ انداز میں کرتا ہے "میں
آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس بیان میں نہ تو کسی کے خلاف بغض یا کینہ
ہے اور نہ ہی کوئی مبالغہ میں آپ کو ایک ایشیائی تمدن کے ساتھ ایک مغربی
تہذیب کے میل کی داستان بتانا چاہتا ہوں اگرچہ ہماری حکومت فراخ
دل تھی اس کے حاکم اپنے اندر خیر خواہی عوام کا جذبہ بھی رکھتے تھے اور
اس کے پیش نظر دوسرے صوبوں کی تعلیمی روایات بھی تھیں لیکن ان سب
باتوں کے باوجود پنجاب کی حقیقی تعلیم مفلوج اور قریب قریب ختم کر دی
گئی۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس کے دوبارہ زندہ کرنے اور
ترقی دینے کے امکانات سے یا تو بالکل بے اعتنائی برتی گئی یا پھر ان کا
ناجائز استعمال کیا گیا۔ میں یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ ناکامی افراد
کی ناکامی نہیں یہ ناکامی حکام کی ناکامی نہیں، یہ ناکامی پورے نظام کی
ناکامی ہے"۔

مسٹر ہاول جو حکومت ہند کے تعلیمی انڈر سکریٹری تھے اپنی ایک کتاب میں جو انھوں نے ہندوستان کی تعلیم پر لکھی ہے۔ تخیل کے اس افسوسناک فقدان کا ذکر کرتے ہیں جس کا مظاہرہ محکمہ تعلیم نے کیا ہے۔

نئے نظام میں تخیل کا فقدان

ارباب حکومت میں ایسا تخلیقی ملکہ موجود نہ تھا کہ وہ نئے نظام کی بنیادیں پرانے آثار پر اٹھاتے اور اس کی تعمیر میں پرانے معماروں کا تعاون حاصل کرتے ان کے اپنے الفاظ میں "بڑے افسوس کی بات ہے کہ جب یکے بعد دیگرے مختلف صوبے ہمارے تحت میں آئے اس وقت عوام کے دل میں ہماری فتح کا اثر تازہ تھا۔ اور اس احسانمندی کا احساس بھی شدید تھا کہ ہم نے انھیں بدامنی اور ظلم سے نجات دی ہے لیکن حکومت نے اس موقعہ سے فائدہ نہ اٹھایا اور اگرچہ دیہی نظام انھیں ہر جگہ جوں کا توں ملا لیکن انھوں نے دیسی مکاتب کو دیہی نظام کا ایک اہم جزو نہ بنایا اگر ایسا کر لیا جاتا، اگر گاؤں کے چندے اس مقصد میں صرف کئے جاتے اگر حکومت بجائے چند نئے اسکول قائم کرنے کے اپنی توجہ درسی کتابوں اور مکتبوں کو بہتر بنانے میں صرف کرتی تو اس سے لوگوں کو یہ پختہ یقین ہو جاتا کہ تعلیم کا خرچ اٹھانے کی ذمہ داری حکومت کے سر ہے نہ کہ عوام کے

سر۔ اگر ایسا کیا جاتا تو یقیناً جزوی تشکیل کی بجائے عام اصلاح کا کام انجام پا جاتا اور آج ہر ایک صوبے میں قومی ابتدائی تعلیم کا تسلی بخش نظام جاری ہو جاتا ہاول کو افسوس ہے کہ حکومت طبقہ علمار کا تعاون حاصل نہ کر سکی وہ کہتا ہے کہ جن لوگوں نے ریاستی تعلیم کے سلسلے میں مختلف ممالک میں مذہبی علماء کی اہم خدمات کا مطالبہ کیا ہوگا۔ انھیں ضرور افسوس ہوگا کہ حکومت کی طرف سے کوئی ایسا قدم نہ اُٹھایا گیا جس سے کہ مولویوں اور پنڈتوں کے گروہ کا دلی تعاون حاصل ہو سکے۔

دیسی تعلیم کی تباہی کی کہانی ایک مکتب کے مُلّا کی زبانی

بربادی کی داستان تو برباد ہونے والوں سے سننے کی ہے۔ لٹر کے نام ایک دیہی مسجد کے مکتب میں پڑھانے والے مدرس نے ایک چٹھی لکھی تھی۔ اس میں اس نے ان ناپاک طریقوں کا ذکر کیا ہے جن سے دیسی تعلیم کو پنجاب میں ختم کر دیا۔ وہ لکھتا ہے:۔

"حضور چاہتے ہیں کہ دیسی مکتبوں میں تعلیم دی جائے لیکن بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ چیف محرر یعنی تعلیمی افسر (ل) تحصیلدار۔ ذیلدار اور نمبرداروں نے انھیں جڑ سے اکھاڑ دیا ہے۔ اگر کوئی ان مدرسوں میں جاتا بھی ہے تو چیف محرر ذیلدار اور نمبردار اسے دھمکاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمہارا اس مکتب میں جانے

سے کوئی بھلا نہیں ہوگا ذیلدار نمبردار اور گورنمنٹ اسکول کے اُستاد دیسی مکتب
کے مدرس کو کہتے ہیں تم ہمیں بدنام کر رہے ہو خبردار اگر زبان تک بھی ہلائی۔ اس
کے بعد گورنمنٹ اسکول کا اُستاد دیسی مکتبوں سے بچوں کو لے جاتا ہے خواہ وہ
اُس کے مدرسہ میں داخل ہوں یا نہ ہوں یہی وجہ ہے کہ بدنصیب مسلمانوں کے
بچے اور بچیوں نے قرآن تک پڑھنا چھوڑ دیا ہے لیکن خیر خدا کی ذات تو
موجود ہے اور پنجاب بھر میں موجود ہے۔ اگر ایک چیف محرر یا ذیلدار ایک بچہ
کو کسی دیسی مدرسہ میں تعلیم پاتے دیکھتا ہے تو اس کے تن بدن میں آگ لگ
جاتی ہے۔ اور جب گورنمنٹ اسکول کا مدرس کسی دیسی مکتب کے طالب علم
کو دیکھتا ہے تو وہ دیسی مکتب کے اُستاد کو بے نقط سُناتا ہے اور نمبردار کو کہتا
ہے کیا تم گورنمنٹ کا حکم ماننے کو تیار نہیں ہو۔ اس مسجد کے ملا کا مزاج درست
کر دو۔ ورنہ میں تمہارے خلاف آگے شکایت کر دوں گا اور جب ذیلدار ملتا
ہے تو وہ کہتا ہے اگر چیف محرر دورے پر آنکلا اور بچے میاں جی کے پاس
ایسے ہی جاتے رہے تو میرے مدرسہ کی عزت کیا خاک رہے گی اور اگر
اتفاق سے چیف محرر آنکلا تو وہ یقیناً میاں جی کو بُرا بھلا کہے گا اور اس کی خوب
خبر لے گا۔ یہاں اس گاؤں میں ایک مدرسہ تھا ایک دفعہ چیف محرر آیا اور
اُس نے ذیلدار سے کہا کہ مکتبوں کی حالت اچھی نہیں اور یہی رائے اُس
نے اس ذیل میں سارے گورنمنٹ اسکولوں کی رائے بک میں لکھدی۔ ذیلدار

غریب نے اپنے گاؤں کا مدرسہ فوراً بند کر دیا اور اسی طرح دوسرے جگہوں کے مدرسے بھی بند ہو گئے۔

جناب عالی اگر آپ کی منشا دیسی مکتبوں کو دوبارہ جاری کرنے کی ہے تو آپ ہر ایک نمبردار اور ذیلدار کے نام حکم جاری کر دیں کہ وہ کسی طالب علم کو ان مکتبوں میں داخل ہونے سے نہ روکے اور جو پہلے سے داخل ہوں ان کو اپنی تعلیم جاری رکھنے دے۔ وہ ادارے جن کی بنیادیں چیف محرر تحصیلدار اور ذیلدار نے اکھاڑ دی ہیں۔ جن کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے اسی صورت میں ہی دوبارہ قائم ہو سکتے ہیں لیکن اگر ایسا انتظام نہ ہوا تو یہ ادارے چل نہ سکیں گے۔"

ہمیں خود پنجاب کے ریکارڈ آفس کی فہرست مطالعہ کرنے پر معلوم ہوا کہ آرنلڈ پنجاب کے پہلے ڈائرکٹر تعلیمات کے زمانے میں اسی مضمون کے احکامات صادر کر دئے گئے تھے کہ کوئی نیا مکتب کسی مسجد میں یا اس کے ملحقہ مکان میں کھلنے نہ پائے۔ ان احکامات کی نقل ریکارڈ آفس پنجاب میں موجود ہے۔

تعلیمی معافیاں

دیسی مکاتب کی تباہی کے سلسلے میں معافیوں کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان معافیوں کی مالی اور ملکی حیثیت اتنی معروف نہ تھی جتنی مدرسوں کے

یا دوسرے اوقاف کی۔ اس لئے ان کے واپس لئے جانے سے سیاسی بے چینی کا اندیشہ نہ تھا۔ اس مسئلہ پر لائٹنر نے خاص تحقیقات کی ہے اور اُس نے ضبط شدہ معافیوں کی ضلع وار فہرستیں بنائی ہیں۔

بقول لائٹنر میں نے بہت سے معتبر ذرائع سے دیسی مکتبوں کے متعلق اس سے بھی بڑھ کر زیادتیاں سُنی ہیں جن کا میں بیشتر ذکر کر چکا ہوں بعض دیہاتوں کے اساتذہ ان دیہاتوں سے نکال دئے گئے ہیں جہاں ان کے آباؤ اجداد ایک سو سال سے پڑھا رہے تھے بعض جگہ اگر جاگیردار نے دیسی مکتب کی معافی کو جو ضبط ہو چکی تھی حقداروں کو واپس دینا چاہا تو اسے ایسا کرنے سے روک دیا گیا سب جگہ جہاں کہیں بھی دیسی مکتب کا اُستاد لاولد مرا تو بجائے اس کے کہ اس کی جائداد معافی کسی دوسرے کے نام جاری رہتی سرکار نے واپس لے لی۔

تعلیمی وقف کا بے جا استعمال

لائٹنر ایسی معافیوں کی اچھی خاصی ایک فہرست دیتا ہے جو خالص تعلیمی مقاصد کے لئے دی گئی تھیں اور بعد میں بحق سرکار ضبط ہو گئیں۔ اس کی رائے میں یہ مثالیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ بنگال میں ہگلی کے مشہور وقف کا بے جا استعمال تو ایک تاریخی چیز ہو کر رہ گیا ہے۔ ۱۸۰۶ء میں ایک مسلمان نے بہت بڑی جائداد کارہائے خیر کے لئے وقف کی تھی۔ مدت تک اسی کی

آمدنی کے وظائف تقریباً سب کے سب غیر مسلم طلباء کو دئے گئے۔ حکومت نے وصیت کے خلاف اس روپیہ سے ہگلی کالج بنایا اور ایک ایسی جائداد سے جو دین اسلام کے کاموں کے لئے وقف کی گئی تھی ایسا نظام قائم کیا جو اس زمانہ کے مسلمانوں کے خیال میں اسلام کے اُصولوں کے منافی تھا۔ جس میں انتظام کے لحاظ سے مسلمان کسی قسم کا حق نہ رکھتے تھے۔ اس کالج کے تین سو طلباء میں سے صرف تین مسلمان طالب علم تھے اسی وقف کے غیر قانونی استعمال کا اعتراف سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان" اور سر فلپ ہارٹوگ نے اپنی کتاب Some aspects of Indian education میں کیا ہے۔

بنگال میں عبادت گاہوں کے نام بیش قرار معافیاں تھیں اور بالعموم ایک مکتب کا قائم کرنا۔ وصیت کا جزو ہوتا تھا لیکن بقول سر ولیم ہنٹر ۱۸۲۸ء میں مالی اور دیوانی دونوں حکام نے مل کر خاص عدالتیں قائم کیں اور پھر تمام صوبہ ۱۸ سال تک جھوٹے گواہوں اور ضبطی کے سخت دل افسروں کی جولانگاہ بنا رہا۔ اس کارروائی میں آٹھ لاکھ پونڈ صرف ہونے پر تین لاکھ پونڈ سالانہ کا اضافہ محصولات میں ہوا۔ اس رقم کا کثیر حصہ مسلمانوں کے اوقاف سے حاصل ہوا۔ اس کارروائی سے سیکڑوں پُرانے خاندان تباہ ہو گئے اور مسلمانوں کے نظام تعلیم ...

تعلیم کا پیشہ جو دیسی سلطنت میں معزز سمجھا جاتا تھا اور ذریعہ معاش تھا۔ بنگال سے مفقود ہو گیا۔ در اصل ان ضبطیوں سے مسلمانوں کے تعلیمی انحطاط کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔

لیکن بقول لائٹنر باوجود ان مشکلات کے دیسی نظام تعلیم ختم نہ ہو سکا وہ لکھتا ہے "۔ اگرچہ ہم برابر اسے ختم کرنے کی نہیں تو کم از کم اس سے بد دل کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ افسروں کی طرف سے اگر تعدی نہیں تو سخت مخالفت ہوتی رہی۔ اور جو لوگ ہندوستانی زندگی کو جانتے ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ایسی چیز کی مخالفت جو حکام کے منشا کے مطابق نہ ہو کس آسانی سے عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ باوجود ان مشکلات کے اگر دیسی نظام تعلیم اس صوبہ میں زندہ ہے تو یہ عوام کی جانب سے انگریزی نظام تعلیم کے خلاف ایک زندہ احتجاج ہے۔ اور ان کی طرف سے ہمارے نظام تعلیم کا بدترین استرداد!"

اس ضمن میں مسٹر ٹامسن کی جن کے نام پر روڑکی کالج بنا ہے۔ ایک تجویز کا ذکر کرنا مناسب ہو گا جس کی رُو سے مکتبوں کے اساتذہ کے لئے خاندانی جاگیر دی جا سکتی تھیں۔ مگر کمپنی کی طرف سے اس کی مخالفت کی گئی اور یہ تجویز مسترد ہو گئی۔

لیکن ستم یہ ہے کہ وہ بات جو انگریزی تعلیم پوری نہ کر سکی۔ ہم نے خود

پوری کردی اور دیسی نظام تعلیم کا خاتمہ ہمارے ہاتھوں ہوا۔

لائٹنر کی رپورٹ ہمارے پُرانے نظام تعلیم کا مرثیہ ہے اور کس قدر دردناک مرثیہ! افسوس یہی ہے کہ اس مرثیہ کا لکھنے والا کوئی ہندوستانی نہیں بلکہ ایک مغرب کا، باشندہ ہے۔ حیرت ہے کہ متاعِ کارواں کے لُٹ جانے کا احساس اہلِ کارواں کو نہیں ہوا ہاں ان کی بے سروسامانی دیکھکر دوسروں کی آنکھیں ایک بار تو نم ناک ہوگئیں، ہماری آئندہ نسلیں اس جرم کو معاف نہ کریں گی کہ ان کے آباو اجداد نے ایک زمانے میں تعلیم کے ایسے نظام کو جو ایک خوشنما پودے کی طرح اس سرزمین سے پھوٹا ہیں پروان پڑھا مجرمانہ غفلت کی سموم سے جھلسا دیا۔ ہمارے پُرانے نظام کے اس انجام کی ذمّہ داری دوسروں پر ہی نہیں بلکہ خود اس دیس کے رہنے والوں پر بھی ہے۔

آپ کے سامنے دیسی مکتبوں کے نظام کا انحطاط اور اس کے انجام کی داستان بیان کی گئی۔ ان حالات کی ذمّہ داری جیسا کہ آپ نے دیکھا دوسروں کے سر نہیں بلکہ ہمارے سر بھی ہے۔ اسلام انسانیت کے اُصولوں پر مبنی مذہب ہے اور یہ پُرانا نظام تعلیم اپنی خامیوں کے باوجود بالعموم ان اقدار کا حامل اور ان کا محافظ تھا۔ اسلام عوام کا مذہب ہے۔ اور یہ نظام تعلیم عوام کی تعلیم کا نظام تھا۔ اگر ہم صحیح معنوں میں ایک اسلامی جمہوری سماج

کی بنیادیں رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں پھر دوبارہ ایک ایسا ہی نظام تعلیم تیار کرنا ہوگا۔

ممکن ہے بعض اصحاب کو یہ خیال ہو کہ مضمون لکھنے والے کا مقصد ایک مرتبہ پھر ویدک زمانے کے آشرم زندہ کرنے یا ازسرِ نو بچوں کے گلوں کو مسجد کے ملّاؤں کے سپرد کرنے کا ہے جہاں وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھیں گے اور فرش پر اپنے آپ کو لٹکن کی طرح ہلایا کریں گے اور گھنٹے کی بجائے اپنے بے روح افسردہ ترنّم سے وقت کا فاصلہ ناپا کریں گے۔

مگر اس مضمون کا یہ مقصد نہیں کہ سب بچوں کو گاؤں کے ابتدائی مدرسے کے گلے سڑے پھوس کے چھپّر میں سے اُٹھا کر مسجد کی صاف ستھری کھلی فضا میں پہنچا دیا جائے۔ بچے آپ کے ہیں آپ کا جہاں جی چاہے انھیں تعلیم دیجیے لیکن آپ کو تعلیم اور اس کے اُصولوں کو مدرسہ کی کال کوٹھری میں بند کرنے یا افسران کی مطلق العنان مرضی کا فرشِ راہ بنانے کا کوئی حق نہیں ہمیں تعلیم کے تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔ اس کے مطالبوں کو ماننا ہوگا اور اس کا پہلا مطالبہ یہی ہے کہ اسے صحیح پس منظر میں جانچا جائے اس کے ارتقائی عمل کا تحفظ کیا جائے اس کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو ملایا جائے۔

تخلیقی ارتقا کے مطابق کسی جاندار کا (اور قوم سے زیادہ جاندار اور ذی روح جسم کیا ہوگا) یکبارگی ارتقائی پُرانی منزلوں کو گھورے پر پھینک دینا کسی

شعوری ذہنیت کی موجودگی کا پتہ نہیں دیتا۔ ارتقائی منزلیں اکثر پرانے سنگ وخشت سے تعمیر ہوتی ہیں اور اگر کسی حصے کو عضو معطل سمجھ کر عملِ جراحی کیا بھی جائے تو یہ کسی ہنرمند جراح کا کام ہونا چاہیئے لیکن پُرانے نظام پر یہ عمل جراحی کسی ہمدرد ماہرِ فن کا مرہونِ منت نہیں معلوم ہوتا۔ ہم نے اپنے سماجی نظام کا ایک اہم حصہ ہی چاقو کی نذر نہیں کیا بلکہ اس کی زندگی کا دھارا دوسروں کے کہنے سے ہمیشہ کے لئے خشک کر دیا۔ اس کی اقدار، اس کی تربیت کو ہاتھ سے کھو دیا۔ روایتی مینڈک کی طرح ہم نے اندھے کوئیں سے باہر جست لگائی تو اپنی دانست میں کائنات کی حدود پار کر گئے لیکن زور میں آ کر محض باہر کی نالی میں آ گرے اور کیچڑ میں لت پت ہو گئے!

تعلیم اور زندگی

مدرسے کی سماجی اہمیت کو آج نہیں ہزاروں سال سے انسان نے سمجھا اور خوب سمجھا ہے جب ایتھنا Athana کے موشگافانہ فلسفہ اور اس کی گھٹیا سیاست سے تنگ آکر افلاطون نے ایک نئے سماج کا تخیل پیش کیا تو اس نے تعلیم کو پوری سماجی تشکیل کا سنگِ بنیاد قرار دیا اس کی نگاہ میں تعلیم قومی زندگی کا ایک ایسا شعبہ نہیں تھا جو دوسرے شعبوں کا دُم چھلا بنا ہوا ہو جس کے وزیر کو گورنر کے ہاں اس وقت باریابی ملتی ہو جب شام کی پرچھائیں لمبی ہوتی جارہی ہو اور حضور گورنر بہادر ٹینس کے لئے تیار ہو رہے ہوں۔ اس کی نگاہ میں تعلیم ایک کسوٹی تھی۔ افراد کو مختلف سماجی طبقوں میں تقسیم کرنے کے لئے اس کی اسکیم میں معلم ایک حاکم تھا۔ پوری سماج پر راج کرنے کے لئے۔ معلم اور حاکم! ممکن ہے آج کل کے انتظامی حکام اس تجویز کا مضحکہ اُڑائیں۔ مگر یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ پُرانی قوموں میں، خواہ وہ بنی اسرائیل تھے یا مجوسی آرین تھے۔ کلدانی ان کے قائد اور ان کے پیام بر ان کے معلم ہوتے تھے۔ جب سے دنیا میں پیام بر آنے بند ہوگئے معلم کا

رُتبہ بھی گھٹ گیا۔ اگر آپ کو کسی تمدن کی ترقی اور سنت کا صحیح اندازہ
لگانا ہو تو اس کے سماجی زینہ پر معلم کی جگہ تلاش کیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا
کہ اس کو سماج میں نہایت نفیس جگہ دی گئی ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے گاؤں
میں اگر کوئی صاحب حیثیت شخص موٹر رکھ سکتا ہے۔ تو گاؤں کا اُستاد
ہے۔ لیکن پنجاب کے اکثر دیہات میں اگر گاؤں کا کوئی آزاد فرد
"کمینوں" کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے تو وہ مدرسے کا اُستاد اور
مکتب کا ملا ہے! کیا یہ مقام عبرت نہیں ہے۔

یہ چیز یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب کبھی دُنیا میں کوئی سیاسی
انقلاب آیا۔ جب کبھی سماج کے پُرانے اور فرسودہ ایوان پر سے نئے
خیالات کی باد صرصر چلی۔ اور اس کی کڑیاں اور ستون جھڑ جھڑا کر گرنے لگے
تو تعمیری کام کے لئے مصلحین نے ہمیشہ مدرسہ کا رُخ کیا۔ فرانس کی مظلوم
سرزمین میں ایک خانہ بدوش کی طرح گشت کرنے والے روسو نے دیکھا
کہ دُور سے چند حیوانی صورتیں کھیتوں میں نظر آ رہی ہیں قریب آ کر غور کیا تو
وہ انسان نکلے۔ اس المیہ انکشاف پر اس کی زبان سے وہ تاریخی جملہ نکلا۔
جس کی صدائیں اب تک وقت کے ایوانوں میں گونج رہی ہیں "انسان آزاد
پیدا ہوا ہے لیکن ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ملتا ہے"۔ اس نے اپنی کتاب
سوشل کنٹریکٹ سے وہ صور پھونکا جس سے ایک دُنیائے خوابیدہ بیدار

ہوگئی۔ مگر جہاں روسو کے عالمگیر طلسم سے سیاسی زنجیر کی کڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں، وہاں تخریبی عمل کے ساتھ ساتھ، اس نے تعمیری کام بھی انجام دیا۔ ایمیل (Emile) لکھ کر اس نے بچہ اور بچہ کے ساتھ بالغ کے لئے ذہنی اور جسمانی آزادی کو ایک زندہ حقیقت بنا دیا کیونکہ تعلیم ہی فرد کو اس قابل بنا سکتی تھی کہ وہ نئی حاصل کی ہوئی آزادی کے تیز نشہ کو سہار سکے اور اس کے خمار کا مداوا کر سکے۔

اسی طرح جب روسی غلام نے استعماریت کے ہاتھوں سے اختیار کا علم چھینا اور تمام مزارع آزاد کسان بن گئے تو ٹالسٹائی Tolostoy نے یسنایا پولیا میں اپنا مشہور مدرسہ کھولا۔ وہ چاہتا تھا کہ روسی محض اس نئے پائے ہوئے باجے سے کھیل کر خوش نہ ہو۔ بلکہ اس سے تعمیر حیات کا کام لے۔ اس کی تانیں اس کی خوابیدہ قوتوں کو جگا دیں۔ میرے دوستو! جب آزادی کے زندگی بخش نغمے نے ان کے ذہنی اور اخلاقی سوتوں کو جگایا تو خود ٹالسٹائی کے لئے غریب کسان بچوں کی تخلیقی کوششوں میں ان کا ساتھ دینا کچھ دشوار ہو گیا۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ ٹالسٹائی ایک نو سال کے بچے کو تخلیقی اندازِ تحریر میں ابھی ابتدائی اشارات بھی نہ دینے پایا تھا کہ بچہ اسے اپنا تخلیقی افسانہ لکھنے کو کہتا ہے بچہ اس درخواست پر مجبور ہے کیونکہ ابھی خود اچھی طرح سے لکھنا نہیں جانتا۔ بچہ افسانہ زبانی بیان کرتا جارہا ہے اور لکھنے میں ٹالسٹائی ہانپتا کانپتا

بار بار پیچھے رہ جاتا ہے اس کی رائے میں ان بچوں کے تخلیقی کارنامے اپنے قسم کے ادب میں دوسری تمام چیزوں پر بھاری تھے۔ انقلاب روس کے بعد تو وہاں تعلیم کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تعلیم اور سیاست کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے معلم اور مفکر نے تعلیم کو ہمیشہ تجدیدِ حیات کے لئے استعمال کیا مگر سیاست والں نے اس کو اپنے اغراض و مقاصد کا آلہ کار بنایا۔ تعلیم شروع میں تو ان کی چہیتی بیوی تھی مگر رفتہ رفتہ اس کی حیثیت کچھ اک مُطلقہ کی سی ہوتی چلی گئی اور آج کل مغرب کی استعمار پسند حکومتوں میں تو وہ بالکل ایک باندی بن کر رہ گئی ہے۔ ان کا نظام تعلیم ایک ہیبت ناک مشین ہے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کارخانہ دار کی سی بے روح صفائی ہے۔ ان ملکوں کی تعلیم کے یہ سیاسی ٹھیکیدار انسان کا ایک خاص ٹائپ، ایک خاص نمونہ تیار کرتے جا رہے ہیں اور جیسے ایک منیجر فون کے ذریعہ پورے کارخانے کا اعصابی مرکز بن جاتا ہے۔ اسی طرح حکومت کرنے والی پارٹی کا دفتر بھی ایک مرکز ہوتا ہے جہاں سے پورا نظام تعلیم ایک بٹن کے ذریعہ کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ سُنا ہے جب ہندوستان کے ایک بہت بڑے معلم وہیں پہنچے تو انہیں ایک فاشی تعلیمی افسر کے کمرے میں جانے کا اتفاق ہوا فاشی افسر جو تعلیم کے اس میکانی تخیل میں عقیدہ رکھتا تھا شاید اس لئے انہیں وہاں لے گیا تاکہ اس عالمگیر مشین کے کل پُرزے

دکھاوے جس سے ایک سڑک کوٹنے والے انجن کی طرح فرد کی ذاتی اپج اور اٹھان کو کوٹ کر ہموار کر دیا جاتا ہے۔ اس کمرے میں وہ دیکھتے ہیں کہ ایک جانب تو ایک ٹیلیفون رکھا ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ کس طرح وہ اس کے ذریعہ ان تمام مدارس کو جو اس کی نگرانی میں ہیں۔ احکام بھیج سکتا ہے اور اس کے ساتھ ایک معنی خیز مسکراہٹ سے اس نے ایک ریڈیو کے قسم کے آلے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اس سے میں ہر وہ چیز سن سکتا ہوں جو کسی مدرسے کے کسی کمرے میں ہوتی ہے۔ شکر ہے وہ مشین اب تک ہندوستان نہیں پہنچی ورنہ اس کے سب سے پہلے خریدار شاید ہمارے افسران تعلیم ہوتے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ ہر انقلاب کے بعد سماج کی نگاہیں بار بار تعلیم کی طرف اُٹھتی ہیں کیونکہ اس سے یہ اُمید ہو سکتی ہے کہ یہ نئے اقدار اور معیار کو مستقل بنا سکے اور ان کی سچی اور حقیقی قیمت لگا سکے گی۔ اس طرح ہندوستان بھی اُمید افزا نگاہوں سے ایک نئے دور کے انتظار میں مشرق کی طرف تک رہا ہے اور نئی تعلیم اس نئے دور کا معاشی اور سماجی پہلو ہے ہم ایک خواب دیکھ رہے تھے خدا نہ کرے وہ خواب کثرت تعبیر سے پریشان ہو جائے۔ ہم ایک خواب دیکھ رہے تھے ایک نئے سماج کا جس میں موجودہ معاشی اور اقتصادی خرابیاں ایک حد تک دُور

ہو جائیں گی، جس میں غیر منصفانہ تفرقات ایک بھولا ہوا افسانہ ہوں گے جہاں ایک فرد دوسرے کا معاون ہو گا اس کا مدمقابل نہیں ہو گا۔ جہاں سماج کا تشکیلی اُصول تعاون اور ہم آہنگی ہو گا، جہاں سوسائٹی کا بنیادی اُصول حیوانی دُنیا کی بہیمانہ کشمکش نہ ہو گا۔

اس خواب کی ایک تعبیر بنیادی تعلیم کی اسکیم تھی وہ تعلیم جس کا مقصد حیات بچے کو ایسی سماج کے لئے تیار کرنا ہے جس میں ہر فرد اپنا بوجھ اُٹھانے کے قابل ہو، جہاں وہ ہر معنی میں آزاد ہو، اقتصادی ذہنی اور سماجی لحاظ سے جہاں اسے ہر قسم کی سہولتیں مہیا ہوں اپنے قوار کی اُٹھان کے لئے، اپنی اُپج کی نشو و نما کے لئے، وہ سماج جس میں ہر فرد اپنا سر فخر سے اُٹھا سکے اور دوسروں کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر دیکھ سکے۔

میرے دوستو! یہ نیا کام آسان نہ تھا مشکل تھا اور بہت مشکل اب تک ہم ایک تعلیمی شاہراہ پر چلتے آئے تھے۔ اس قسم کی صاف شفاف اور امن والی سڑک جیسی ہمارے آقاؤں نے گرانڈ ٹرنک روڈ کے نام سے ہمارے لئے بنا دی ہے۔ ہمیں وہ بھیڑوں کے گلے کی طرح سے اس پر ہانکتے چلے آئے اور ہمارے ہانکنے کے لئے ایک محکمہ بھی بنا دیا جس کا نام پبلک انسٹرکشن کا محکمہ رکھا گیا۔ تعلیم کا محکمہ نہیں بلکہ عوام کے لئے ہدایات کا محکمہ۔

میرے عزیزو! یہ ایک مہربان ماں کی ہدایتیں نہ تھیں یہ اس قسم کی ہدایات تھیں جو اکثر شہروں کی سول لائنز میں لکھی ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ پرائیویٹ روڈ ہے۔ یہاں اندر آنا منع ہے۔ احاطہ میں سیر کرنے والا گرفتار کیا جائے گا ہمارے ان نگہبانوں کو بھیڑوں کے مفاد کا اتنا فکر نہ تھا جتنا اِردگرد کے لہلہاتے کھیتوں اور شاداب باغوں کا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بھیڑوں کا گلہ کسی کے کھیت میں نہ گھس جائے وہ اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیاب ہوئے۔ سرمایہ داری کے باغ اور کھیت محفوظ رہے مگر بھیڑوں کے لئے کہیں بھی چارہ باقی نہ رہا۔ پہلے تو کہیں کہیں کچی کچی گھاس پر منہ مار ہی لیا کرتی تھیں اب تو سب دروازے ان پر بند ہو گئے۔

میرے دوستو! ایجوکیشن اور انسٹرکشن میں وہی اُصولی فرق ہے جو ایک انسان اور مشین میں ہو سکتا ہے تو اب تک ہماری تعلیم محض میکانی تھی۔ اب تک ہماری تعلیم محض خواص کے لئے تھی۔ عوام کے لئے نہیں۔ اب تک ہماری تعلیم نظری تھی عملی نہیں۔ اور نظری بھی نہیں بلکہ تنگ نظری!!

مگر خواص کو اس کا علم نہ تھا کہ عوام بھی ہیں۔ اگر وہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں تو عوام کروڑوں ہیں۔ خواص عوام کے بغیر پل بھر زندہ نہیں رہ سکتے مگر عوام ان کے بغیر صدیوں سے زندہ چلے آئے ہیں اور رہیں گے۔ جانے ان اللہ کے بندوں کو غریب عوام سے اس قدر بیگانگی کیوں تھی؟

اللہ میاں تو میرے خیال میں غریبوں سے محبت کرتا ہے۔ ورنہ اتنے ڈھیروں کے ڈھیر کیوں پیدا کرتا۔

اب بنیادی اسکیم کے ماتحت حقیقی تعلیم شروع ہوئی ہے اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ بنیادی اسکیم سے پہلے کوئی ادارے نہ تھے مگر جامعہ اور شانتی نکیتن کے نخلستانوں سے پورے صحرا کی ویرانی چھپ نہیں سکتی اور نہ ہی ایک بلبل سے خزاں کا اُجڑا ہوا چمن نغمہ ستان بن سکتا ہے۔ نئی اسکیم کا اجراء گویا تعلیمی شاہراہ پر ایک نشانِ میل تھا جس پر کھلے اور جلی حروف میں لکھا تھا کہ یہاں سے تخلیقی اور تعمیری دور کی سرحد شروع ہوتی ہے جو بچے کی ہمہ گیر نشو و نما میں ممد و معاون ہوگا۔

اس اسکیم کا مرکز بچہ ہوگا اور اس بچہ کو تیار کرنا ہوگا اس کے سماجی معاشی اور طبعی ماحول کے لئے۔ سوال یہی تھا کہ کس ماحول کے لئے؟ کیا وہی ماحول جس میں وہ پیدا ہوا؟ کیا اسے بھی اپنے ماں باپ کی طرح پرانے بندھنوں میں گرفتار رہنا ہوگا؟ کیا اسے بھی توڑ موڑ کر ٹھونس ٹھانس کر پرانے سماج کے سانچے میں سمانا ہوگا؟ نہیں نہیں نئی تعلیم کا مقصد اس سے کہیں بلند ہے اس کا مقصد بچے کو کسی ماحول کے لئے تیار کرنا نہیں بلکہ مدرسوں کی امداد سے ایک نئے ماحول کی تخلیق کرنا ہے۔

لوگ ہنستے ہیں کہتے ہیں کہ ان مسجد کے ملاؤں کی امداد سے تم ایک نئی

سماج کی بنیاد ڈالو گے! لوگ تم پر ہنستے ہیں، میرے دوستو لوگوں کو ہنسنے دو ہنستے ہی گھر بستے ہیں، سماج کی کشتی میں آگے ہی سوراخ ہو چکے ہیں، قہر انگیز فودے اس کے اندر سے نکل رہے ہیں، اس کشتی کے سرمایہ دار خود بنے ہوئے کھیون ہار کہیں چھپڑ اکھٹولس کر کہیں گھنٹنا ٹیک کر ان کو بند کر رہے ہیں انھیں یہ حرکات مذبوحی کرنے دو، اس ٹوٹے ہوئے ایوان میں، اس جھڑ جھڑاتی ہوئی عمارت میں صبح کی جاں بخش ہوا کے جھونکے آکے رہیں گے اور وہ زہریلے جراثیم جو ایک مدت سے اس میں پل رہے ہیں سرکر رہیں گے۔

میری مراد اس سے یہ نہیں کہ ہم لوگ مدرسے کو چھوڑ کر سیاست کے میدان میں پھاند پڑیں، میری مراد تو یہ ہے کہ ہم نئی تعلیم کے ذریعہ بچے کے خیالات میں ایک نئی لہر، اس کے عمل میں ایک نیا رُجحان پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ میرے دوستو! خیال کی دُنیا میں بڑی طاقت ہے خیال وہ عظیم الشان طاقت ہے کہ اس کی لبلبی اگر اتفاقاً دب جائے تو فطرت کی طاقتیں اور دوزخ کی قوتیں اس کے سامنے لرز جاتی ہیں

ہم بچے کو ایک بنیادی حرفے کے ذریعہ سے تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ پس ہمارا ابتدائی اصول عمل ہے قول نہیں، یہ نئی اور پرانی تعلیم میں پہلی حدِ فاصل ہے ایک عملی ہے دوسری قولی، ایک میں حرکت ہے دوسری میں سکون وجمود اور اگر حرکت ہے بھی تو وہ شعوری نہیں۔

دوسرا نشان امتیازِ ربط کا وہ اصول ہے جس سے تمام مضامین کیسی رنگین کسی قدر جاذبِ نگاہ بنت میں کاڑھ دیئے گئے ہیں، اب درس کے مضامین علیحدہ علیحدہ پیوند نہیں ہوں گے، ایک فقیر کے مانگے ہوئے چغہ کی طرح جس پر رنگ برنگ کی ٹکلیاں لگی ہوئی ہیں، یہ ایک پوشاک ہوگی جو بچے کے ذہنی اور اخلاقی قد پر راست آسکے گی۔ تعلیم کے مضامین میں الگ الگ ڈربوں میں بند اور مفید نہ ہوں گے جہاں وہ ندی کے پیچھے چھوڑے ہوئے پانی کی طرح علیحدہ علیحدہ گڑھوں میں پڑے سڑ رہے ہوں۔ علم ایک لہراتا ہوا اٹھا کھیں مارتا ہوا دریا ہوگا، تازگی اور شادابی کا علمبردار، زندگی اور حرکت کا پیغام بر۔

مگر اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ بچہ ہر صنعت و حرفت کے معاشی اور اخلاقی پہلوؤں کو پہچان لے گا۔ بچہ ہر پیشہ اور ہر پیشہ ور کی اہمیت کو جان جائے گا۔ وہ سمجھ لے گا کہ ہر ادنیٰ سے ادنیٰ پیشہ ور ایک جزوِ لاینفک ہے سماجی تعمیر کا اس کے بغیر سوسائٹی کا ایوان سونا نہیں نامکمل ہے، بدصورت نہیں بے ڈول ہے۔ جس امیر کے بچے نے رندہ چلاتے ہوئے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا ہے وہ دوسری بار جب ایک بڑھئی کو کام کرتے دیکھے گا تو اس کا دل چاہے گا کہ وہ اس کھردرے ہاتھ کو عزت سے چومے جس پر مشقت کی زندگی نے گہری لکیریں کھینچ دی ہیں، اور جب ایک غریب بچہ اپنے پیشہ

میں داخل ہوگا تو وہ اس کی پوری سماجی اور معاشی اہمیت کو سمجھے گا وہ اپنا مقصد آپ ہوگا وہ دوسروں کا آلۂ کار نہ ہوگا وہ جان لے گا کہ وہ بھی سماجی مشین کا ایک پرزہ ہے لیکن نہایت اہم پرزہ، پرزہ کیا وہ سماجی جسم کا ایک عضو ہے۔ وہ حصہ جو خود اپنے فعل کا شعور رکھتا ہے اور اپنے تعلقات کا جو دوسروں کے ساتھ ہیں۔

جہاں تک مادری زبان کا تعلق تھا آپ نے اس کا پورا پورا حق ادا کیا، آزاد ہندوستان میں آزاد شہری کے لئے آزادانہ اظہار رائے کی ضرورت ہے قسمت نے مدتوں ہمیں اپنی مادری زبان میں قوتِ اظہار سے محروم رکھا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے بولنے والے گونگے، ہمارے سننے والے بہرے اور ہمارے دیکھنے والے اندھے ہوگئے۔ آپ کی نئی کتابوں میں ہندوستان کے بے زبان طبقے نے (اور بے زبان جانوروں میں ہی نہیں ہوتے، انسانوں میں بھی ہوتے ہیں) زبان پائی ہے، اُن کے کان ایک نئی صدا سننے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا آگئی ہے، یہ کتابیں صحیح معنوں میں عوام کے لئے ہیں۔ اُن کے دُکھ درد کی سچی تصویریں اُن کی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ اور اُنھیں ہی پڑھائی جائیں گی، ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ مادری زبان باندی نہیں پھر رانی بن گئی ہے اور وہ باندی جو رانی کی جگہ چھین کر خود رانی بن بیٹھی تھی اس جرم میں ملک بدر کردی گئی ہے شاید یہ سزا تو کچھ زیادہ ہی سخت ہے۔

پھر ایک آزاد ہندوستان کی آزاد شہریت پر ایک نئے رنگ میں زور دیا گیا ہے۔ اب بچوں کو اہلکاروں کے حقوق نہیں جتائے جائیں گے بلکہ قومی خدمت گاروں کے فرض بتائے جائیں گے۔ تاریخِ ہندوستان کے نصاب کا وہ تاریک کونا جس میں علم شہریت کے چند حقائق بٹھے رہتے تھے۔ اب کتاب میں بند نہ رہے گا بلکہ ہمارے گاؤں اور شہر کی زندگی میں قوت عمل کی تازہ روح دوڑا دے گا۔ آپ کے ہاتھوں کا نکلا ہوا طالب علم تیسرے درجے کے ٹکٹ گھر کے سامنے اپنا جسمانی تطابق اس ڈھنگ سے نہ کرے گا۔ کہ ایک کی کہنی دوسرے کی پسلی میں اور دوسرے کا گھونسا پہلے کی ناک پر ہو۔ میرے خیال میں جس دن ہم ایسے موقعوں پر اپنی باری کے لئے انتظار کرنا سیکھ جائیں گے۔ اس دن ہمیں اصل راج حاصل ہو جائے گا۔ مگر دوستو! جیسے ایک دولھا کے بغیر بارات بے رونق نہیں بے معنی ہوتی ہے، اچھے تربیت یافتہ اُستادوں کے بغیر یہ اسکیم بھی ناکام رہے گی۔ اب تک اُستاد تعلیمی بارات کا مشعلچی رہا ہے اس کی حیثیت ایک تماشا دکھلانے والے کی رہی ہے۔ کہتے ہیں ایک دفعہ میر انشا کے کسی دوست نے دربار لکھنؤ سے خفا ہو کر دکن کا ارادہ کر لیا۔ انشا کو نواب سعادت علی خاں سے ان کا عندیہ ظاہر کرنا تھا۔ عرض کرنے لگے حضور آج عروسِ دولت کو دیکھا۔ کانوں میں دو بندے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ وہ کون؟ دونوں صاحب زادے۔ گلے میں

چند دن بار دیکھ رہا تھا۔ وہ گوشہ ذریعہ گر اٹھے ۔ جو نظر جاتی ہے تو کلیجہ دھک سے رہ گیا
اللہ سہاگ قائم رکھے۔ (اپنے دوست کا نام لیکر) وہ کہیں نظر نہیں آتے۔ تو میرے
دوستو! اس بنیادی اسکیم کے سہاگ کو قائم رکھنے والے تم ہی ہو۔

ایک اچھے اُستاد کے بغیر سارے تعلیمی منصوبے بیکار رہ جاتے ہیں سب
اسکیمیں اکارت ہو جاتی ہیں۔ تمام مدرسے فضول ہوتے ہیں بعض یوں کہتے ہیں کہ
نئی تعلیم کی کامیابی حرفے کو صحیح طریق سے پڑھانے میں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ نئی
تعلیم کی کامیابی ربط کے اُصول میں ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس کامیابی کا راز اگر
کسی چیز میں پنہاں ہو سکتا ہے۔ تو وہ اُستاد کے جوش و خروش میں۔ اس کے ولولے
ہیں۔ اس تڑپ میں جو ایک اُستاد اپنے کام کے لئے اپنے دل کی گہرائیوں میں
پاتا ہے۔ ان بچپن کے جذبات اور تاثرات میں جو اب تک اس کے دل میں خوابیدہ
ہیں۔ اور جنہیں ایک اچھے مدرسہ کا ماحول بیدار کر سکتا ہے۔

تم دل میں ضرور کہتے ہو گے کہ خوب یہ حضرت تو اچھے خاصے سرمایہ دار
ہیں۔ علمی لحاظ سے بھی اور مالی لحاظ سے بھی۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو زندگی کی
کشمکش سے کسی نہ کسی ترکیب سے بچ نکلے ہیں۔ خود کنارے پر ہیں۔ ہم موج اور
گرداب حائل کا منظر دیکھ رہے ہیں اور ہمیں نصیحت کرتے ہیں کہ تم اسی کشمکش میں رہو۔
اسی زندگی کے گندے جوہڑ میں کیچڑ اُچھالتے رہو۔ میرے عزیزو۔ میں اس قصور
کا اعتراف کرتا ہوں۔ اگرچہ میں باہر کھڑا ہوں۔ مگر میرا دل احساس رکھتا ہے کہ

اس گرانمایہ کشمکش کا جس میں تم مردانہ وار ہاتھ بٹا رہے ہو۔ تم مجاہد ہو۔ ایک خاموش انقلاب کے مردانہ وار مجاہد۔ اگر محمل زندگی گراں ہے، تو حُدی کو تیز کر اور تیز پڑھو۔ اگر جام حیات تلخ کام ہے تو اس میں تھوڑی سی تندی اور شامل کرد

اگر اس ادارے سے وابستہ سماج تمہاری خاطر خواہ قدر نہ کرسکے تو دل شکستہ نہ ہونا۔ ہماری سماج وہ سماج ہے جس میں تعلیم کے سب ہی پہلوؤں پر قیمت لگا دی جاتی ہے۔ قیمت کیا۔ اکثر سٹا بازی کردی جاتی ہے۔ مگر اس کی اصل غایت کے لئے ایک کوڑی بھی نہیں دی جاتی۔ آہستہ آہستہ ہمارے سماج میں بھی اقتداری تبدیلیاں ہوتی جا رہی ہیں۔ اس ماحول میں بھی نگاہیں آہستہ آہستہ اصلی قیمت کی طرف اٹھنے لگی ہیں۔ تصنع اور بناوٹ کے مقنع جو سرمایہ دار اور استعمار پسند حکومت نے ہماری آنکھوں پر ڈال دیئے ہیں۔ اُترتے جاتے ہیں۔ لوگ آہستہ آہستہ انسان کو اپنے اصلی رنگ میں پہچاننے لگے ہیں۔

میرے دوستو! سماجی ڈھلائی کے عمل میں اُستاد کبھی گھاٹے میں نہیں رہیگے ان کا رنگ تو پُرانی عہد مغلیہ کی چھینٹ کا سا ہے جو جتنا دُھلتا جائے۔ اتنا نکھرتا آتا ہے دوسرے نقلی رنگ آہستہ آہستہ پھیکے پڑتے جائیں گے۔ مگر زمانہ تمہارے کام کی قدر زیادہ کرتا جائے گا۔ اپنے کام کو ارد گرد کے ماحولی معیار سے نہ جانچنا آئندہ آنے والی نسلیں تمہارے کارناموں پر فخر کریں گی۔ اور تمہارا شوق اور ولولہ وہ تابندہ جوہر ہوگا جس سے مدرسے کی فضا جگمگا اُٹھے گی۔

مدرسہ کی فضا۔ یہ فضا ہی تو وہ اسپرٹ ہے جو انسان دیکھتا نہیں لیکن محسوس کرتا ہے۔ ایک ادارہ ہوتا ہے جس میں انسان سانس لیتا ہے۔ تو گھبراہٹ سی ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے کسی قصاب خانے کی سی بوباس ہے۔ دوسرا ادارہ ہوتا ہے جس میں انسان محسوس کرتا ہے کہ بجلی کی سی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ اس میں حرکت ہے، آزادی ہے

میرے عزیز وابہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تمہیں ایسا ادارہ کام کرنے کو ملا ہے جس کا بنیادی اُصول آزاد ضبط ہے۔ جہاں انسان اسی غلام ستھان میں بھی کم از کم چند سال آزادی کی ہوا میں سانس لے سکتا ہے۔ جہاں اُستاد اس مالی کی طرح ہے۔ جس کا بلند تخیل ہمیں فردیل نے لنڈر گارٹن (بچوں کا باغ) کی شکل میں دیا تھا۔

اُستاد ایک تخلیقی مالی ہے۔ اس کے جماعتی باغ میں ہر قسم کے پودے ہیں کچھ گہرے شوخ رنگ کے ہیں۔ کچھ ہلکے رنگ کے بعض کا قد لمبا اُٹھتا چلا گیا ہے بعض کا میلان پھیلاؤ کی طرف بڑھتا چلا گیا ہے۔

جیسے باغِ جہان کے مالی نے ہر پھول کی خود آبیاری کی، ہر اچھا باغبان پودے کی انفرادیت کا خیال رکھتا ہے۔ اس کے لئے صحیح قسم کی غذا۔ دھوپ اور ہوا پہنچاتا ہے تاکہ وہ زندگی کی تڑپ جو اس میں پنہاں ہے، پوری آب وتاب سے پھوٹ کر نکلے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی دیکھنا ہے کہ یہ پودا باغ کے اس

گوشے میں لگے۔ جہاں اس کا رنگ دوسروں سے ہم آہنگ ہو، جہاں اس کی مہک سے پورا باغ ایرانی قالین کی بہار دے سکے۔

تو میرے عزیزو! تمہیں بھی ایسا ہی بننا ہے۔ تمہیں بھی زندگیوں کی تعمیر کا کام کرنا ہے۔ ایسی زندگیاں جو اپنے آپ میں بھی پوری نشو ونما پائیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی میں بھی پورا حصہ لیں۔ سماجی باغ میں ان کا رنگ دوسروں کے رنگ کو اور بھی چمکا دے۔ ان کی مہک کو اور بھی مہکا دے۔ اور یہ نہ سمجھ لینا کہ اس معاملہ میں تم سب کچھ دینے والے کھونے والے ہو۔ نہیں۔ تم پانے والے بھی ہو کیا باغ کی رنگینی سے مالی کے دل پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔ کیا ایک آرٹسٹ ایک نقش کی تکمیل کرکے خود بھی اخلاقی اور ذہنی لحاظ سے ترقی نہیں کر جاتا۔ کرتا ہے اور ضرور کرتا ہے۔

میرے عزیزو! تعلیم بھی تمہاری زندگی پر ایسا ہی اثر کرے گی۔ علم تدریس میکانکی سائنس نہیں، یہ ایک آرٹ ہے۔ اگر تم بچوں کو زندگی دوگے، اگر تم اپنے دہکتے ہوئے شعلے سے ان کے انفرادیت کے چراغ کو جلاؤگے تو اس کے ساتھ ساتھ تمہارا شعلہ بھی بھڑکے گا۔ اُستا کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ اس کے پاس ازلی اور ابدی نوجوانی کا یہی گر ہے۔ میرے دوستو! آج بھی میں جب کبھی بچوں کو پڑھاتا ہوں تو بعد میں اکثر محسوس کرتا ہوں کہ میرا تخیل ضرور کچھ نہ کچھ پہلے سے بلند ہو گیا ہے۔ ذہنی اور جذباتی زندگی کے بعض ایوان جو اب تک مجھ پر بند تھے کھل گئے

ہر اچھے سبق کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھ میں ضرور کوئی نہ کوئی بہتر تبدیلی آگئی ہے
میرے عزیزو! میری دُعا ہے کہ تم کامیاب اُستاد بنو۔ تم ایک مزدور ملک کے مزدور اُستاد ہو گے۔ ایک مزدوروں کی تعلیمی اسکیم کے مزدور معمار ہو گے۔ تمہاری ناکامی میں اسکیم کی ناکامی اور تمہاری کامیابی میں اسکیم کی نہیں ملک اور قوم کی کامیابی کا راز چھپا ہے[1]۔

---

[1] یہ مقالہ جامعہ ملیہ کے اُستادوں کے مدرسہ کی انجمن اتحاد کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔

اچھا مدرسہ

(یہ مضمون استادوں کے مدرسہ میں ریفریشر کورس کے توسیعی لکچروں کے سلسلے میں پڑھا گیا تھا۔)

چند تمہیدی الفاظ

ریفریشر کورس کے منتظمین نے مجھ سے اچھا مدرسہ کے موضوع پر کچھ کہنے کی فرمائش کی ہے۔ فرمائش کیا ہے اچھی خاصی ستم ظریفی ہے۔ اور میرے خیال میں تو یہ اصحاب طبعاً ستم ظریف واقع ہوئے ہیں، اس کا تجربہ آپ کو یقیناً اس ریفریشر کورس کے دوران میں ہو گیا ہوگا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک ریفریشر کورس کا سب سے ریفریشنگ (یعنی لطف آفریں) پہلو یہی ستم ظریفی ہے، اگر میں ایک لمحہ کے لئے بلند اُصول کی خطرناک سطح مرتفع سے اُتر کر ذاتیات کی داستان چھیڑ دوں تو آپ حضرات مجھے معاف رکھیں میں اتنا کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ طوطوں کو تو لاکھ پڑھایا اگر پھر بھی لوگوں کو ان کی لیاقت پر شبہ ہی رہا۔ تو بھلا بڈھے طوطوں کو پڑھانا انتہائی ستم ظریفی کی بات نہیں تو کیا ہے لیکن انتہا تو یہ ہے کہ ایسے

فرد کو جس نے تعلیمی زندگی کی ابتدا برے اسکولوں میں کی اور پورے سلسلۂ تعلیم کو برے مدرسوں میں جاری رکھا۔ پھر چند اک برے بھلے مدرسوں کا اُستاد بھی رہا اور اپنے شاگردوں کو بھی انہیں جیسے مدارس میں معلمی کے لئے تیار کر رہا ہے۔ اگر ایسے فرد کو اچھے مدرسے کے موضوع پر کچھ کہنے کی دعوت ''رندانہ'' دی جائے اور آپ اس دعوت کی داد نہ دیں تو یقیناً مجھے آپ کے مذاق سلیم سے شکایت رہے گی اگر ہم رات کی تاریکی سے گھبرا کر پوچھیں کہ خدا کے واسطے بتاؤ روشنی کیا ہے تو آپ ہی کہئے دوسرا خاک بتا سکے گا۔

کہتے ہیں کہ لقمان سے کسی نے پوچھا تھا کہ عقل کہاں سے سیکھی تو اس نے جواب دیا بے عقلوں سے! اگر مجھ سے کوئی صاحب یہ پوچھنے کی جراٗت فرمائیں کہ آپ نے اچھے مدرسوں کے متعلق کہاں سے علم حاصل کیا تو میں یہی کہوں گا ''برے مدرسوں سے!''

اچھے مدرسے کہاں ملتے ہیں

اچھے مدرسوں کی ہر جگہ کمی ہے مگر اس سے زیادہ کمی اچھے مدرسے ڈھونڈنے والی ہمت کی ہے۔ آپ کو اگر اچھے مدرسوں کی تلاش ہے تو روماں کے یا سکے شہزادے کی طرح آپکو دُور اُفق کے پار جانا ہوگا۔ وادیوں کی خاک چھاننا ہوگی آموں کے کنجوں اور چڑھتے ہوئے سورج کے دیس میں ان کو تلاش کرنا ہوگا۔ تعلیم

کی دیوی سولہ سنگھار کر کے کبھی شہر کے بازاروں میں نہیں بیٹھتی۔ اگر آپ کو اُس کے سولہ سنگھار والی جھوٹی دیویوں کی تلاش ہو تو جائیے کسی مدرسے کو معائنہ والے دن دیکھئے آپ کو یہ جھوٹی دیوی جھنڈیوں اور کیلے کے دروازوں کے پیچھے انسپکٹر صاحب کے لئے ہمہ تن انتظار بنی ہوئی ملے گی، مگر تعلیم کی دیوی کو شہر کے کوچوں یا بازاروں میں نہ ڈھونڈھیے، یہ تو دھانی پوشاک پہنے، بسنتی چولی لگائے آپ کو دیہی ہندوستان میں ملے گی۔

ہمارا دیس دیہات کا دیس ہے اور ہمارے اچھے مدرسے بیشتر دیہات میں ہی ملیں گے۔ ان مدرسوں میں جامعہ ملّیہ بھی ہے اور شانتی نکیتن بھی، موگہ بھی ہے اور ہمارے بنیادی مدرسے بھی۔

آپ نے پچھلے چند ہفتے جس فطرت کے گہوارے میں گزارے ہیں وہی فطرت ایک اچھے مدرسے کے لئے بہترین پس منظر ہے، اور کھلے کے پانی میں زندگی کی شیرینی ملی ہوئی ہے اور اس کی تلخ کامی بھی۔ یہاں ہمارے پاؤں جو زمین کے سچے عاشق اور بار بار اس کا منہ چومتے ہیں، کبھی اپنے اس محبوب کی درشت مزاجی سے آشنا ہوتے ہیں، کبھی اس کے مزاج کے نشیب و فراز کو پانے کی سعی کرتے ہیں مگر اس کے مزاج ذرا سمجھ کر پائیے گا۔ یہاں بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ اس کے دریا کی جادواں روانیاں ہمیں زندگی کی اس رو کا پتہ دیتی ہیں جو چٹانوں سے کھیلتی ہوئی اور ساحل سے مچلتی ہوئی آگے بڑھتی چلی

ہے۔ تعلیم کے یہ غیر شعوری تاثرات بھلا کسی دوسرے ماحول میں بچوں کو کہاں نصیب ہو سکتے ہیں یہ تو اچھے مدرسوں میں ہی ملتے ہیں۔

ٹیگور کا تخیّل

ہمارے ملک میں اچھے مدرسوں کی کمی کو کئی ایک حساس دلوں نے محسوس کیا کئی ایک دل دھڑکے مگر دھڑک کر رہ گئے۔ آخر کار ہماری نئی پود کی اس روحانی کور نصیبی کو دیکھ کر ایک شاعر کا دل بھی دھڑکا اور جب ایک شاعر کا دل دھڑکتا ہے تو اس کی کسک میں تخلیقِ ازل کی وہ تڑپ پنہاں ہوتی ہے جس سے یہ کارخانہ حیات ظہور میں آیا۔ یہ شاعر ٹیگور تھا۔ ٹیگور نے اس کمی کو ایک شاعر کے شدید احساس سے محسوس کیا اور اپنی زندگی کی چالیسویں منزل میں شانتی نکیتن کے مدرسہ کی بنیاد ڈالی وہ زندگی کی شاہراہ پر ابھی نوجوانی کے طوفانوں اور اُس کی رومانوں سے بھری ہوئی فضا سے نکل ہی پاتے تھے کہ انھوں نے ایک مرتبہ پھر مڑ کر دیکھا، وہ وادی میں اُن کے جیون کی پگڈنڈی چکر کھاتی سمٹی سمٹائی چلی آتی تھی اور نوجوانی کے لہلہاتے ہوئے شاداب نخلستان سے پرے ایک بنجر صحرا تھا۔

وہ کیا اُن کے مدرسے کا بے کیف، اور غمناک زمانہ وہ منزل جہاں زندگی کی شادابیاں ناپید تھیں اور اُن کی جگہ مدرسے کے سخت ڈسک اور تختۂ سیاہ ان پر ہنسی اُڑا رہے معلوم ہوتے تھے ایک شاعر کی دوررس نگاہوں سے انھوں نے دیکھا

تو اس منزل میں کوئی ہنستا کھیلتا سو ڈنا پھلا نگتا بچہ اپنی ٹھکیلی چال میں البیلے انداز میں زندگی کی شاہراہ پر نہیں چل رہا تھا، بلکہ اس کی بجائے ایک قافلہ چالیس[1] مظلوم یتیموں کا جو سب کے سب ایک ہی رسی میں بندھے ہوئے ایک ہی زنجیر میں کسے ہوئے چپ چاپ راست چپ راست کرتے ہوئے ایک ساتھ آگے بڑھ رہے تھے وہ پاؤں جو آزادی کی دیوی کا عطیہ تھے اور میرے خیال میں تو یہ پہئے جو ہمارے گناہوں کی پاداش میں پاؤں بن گئے ہیں چینی عورت کی طرح ایک جیسے قلبوت میں کسے ہوئے ان کے دل و دماغ پر قواعد بندی کے بھاری قفل پڑے ہوئے۔

یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ انسانوں کی دنیا کے ننھے فرشتے" نہیں بلکہ حبشی غلاموں کا ایک گلہ ہے جنہیں اُن کے سفید آقا افریقہ کے جنگلوں سے پکڑتے تھے اور ایک ساتھ ایک ہی زنجیر میں کستے تھے۔ اور سب کو ایک ساتھ چلاتے تھے۔ بعض لوگ رفتار ہنٹر کی چمک سے ہی بھڑک اٹھتے تھے۔ اور ایک جست مار کر افق کی حدود کے پار گزر جانا چاہتے تھے مگر جو نہی کنوتیاں کھڑی کیں اور زقند لینے کو ہوئے، ابھی پر ہی تول رہے تھے کہ ایک جھٹکا لگا اور اس جھٹکے کے ساتھ زنجیر کی ہولناک جھنکار، وہ بھول گئے تھے مگر اس جھنکار نے سب کچھ یاد دلا دیا۔ انہیں تو چالیس اور ساتھیوں کے ساتھ ایک ہی دربے میں مارک ٹائم کرنا ہے اور ان کے پیچھے چند اک ہمت کے ہارے لنگڑاتی ہوئی بطخوں کی طرح سانس پھولا ہوا دم چڑھا افتم و خیزاں چلے آ رہے ہیں۔ ایک دم

---

[1] ہر جماعت میں چالیس لڑکے ہوتے ہیں۔

کے لئے بھی رکھے تو زنجیر کے ساتھ گھسٹے اور گھسٹتے ہی نیچے - اور ان سب کے اوپر

اور سپر کا ہنٹر۔

تخیل کی عملی اور تعمیری صورت

جب ٹیگور نے زندگی کی شاہراہ پر پیچھے نظر ڈالی تو انھیں کچھ ایسا منظر دکھائی

دیا ہوگا، صبح کی دھوپ میں ہانکنے والے کا ہنٹر چمک رہا تھا، یہ ہانکنے والا کون؟ یہ

ہانکنے والا محکمۂ تعلیم تھا - وہ محکمہ جس کی آن جماعت بندی، جس کی شان قواعد بندی

اور جس کی جان کوڈ کی پابندی ہے۔ ٹیگور اب اس منزل سے بہت دور تھے اس کی

زنجیروں کی جھنکار سے دور، اس کے لانبے ہنٹر کے سرے سے اور بھی دور، اب

وہ اس سے اتنی دور پہنچ چکے تھے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے محفوظ سمجھتے تھے، ان کے

دل میں رہ رہ کر یہ خیال اٹھتا تھا کہ مجھے میرے خالق نے بنایا، میرے ماں باپ نے

پروان چڑھایا تو پھر بیچ میں یہ محکمۂ تعلیم کون؟ انہیں اس کا شبہ ضرور تھا کہ ان کی

پیدائش کے وقت نہ تو خدا نے محکمۂ تعلیم سے مشورہ لیا تھا اور نہ ہی ان کے والدین

نے باقاعدہ طور پر محکمانہ اجازت لی تھی، لیکن اس میں ان کا کیا قصور تھا اور

دوسرے بچوں کی کیا غلطی تھی - یہ غلطی تو اللہ میاں کی تھی یا والدین کی اگر یہ

بھلے لوگ محکمۂ تعلیم سے پہلے مشورہ کر لیتے تو محکمۂ تعلیم کی قینچیاں اور ان بچوں کی پیٹھ

پر ایجوکیشن کوڈ اور قوانین اور ضبط کے مطابق کیوں پڑتیں -

اس کا ایک پہلو مطالعۂ فطرت

ٹیگور محکمۂ تعلیم کے خلاف تھے وہ اس بے روح سسٹم کے خلاف تھے جو تعلیمی نظام کے نام سے ہمارے ملک میں رائج ہے وہ جاگیرداری کے اس آئین سے نالاں تھے جس کی رو سے تعلیم سیاست کی پیشواز کا دامن یوں تھامے ہوئے ہے جیسے اکثر رد مسار کے نیچے خدامِ باادب کی طرح جشن کے موقعہ پر والسرائے کی پوشاک کا دامن سنبھالے رہتے ہیں، ان حالات سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنا نیا مدرسہ شانتی نکیتن کے نام سے دیہی بنگال کی پہنائیوں میں کھولا۔ وہ پہنائیاں جہاں آملے کے پتے خزاں کی ہواؤں میں تیز اور تیکھے سُروں کے گیت گاتے ہیں جہاں بچے آموں کے کنجوں میں فطرت کا سبق فطرت کے ڈیسکوں پر بیٹھ کر سنتے ہیں۔ یہ فطرت کے ڈیسک! بعض بچے تو اپنے ساتھ بیٹھنے کی چٹائیاں رکھتے ہیں، اور ایک صاحب تو پوری شان سے ایک درخت پر جلوہ فرما ہیں، اس ہیئت سے کہ گویا آسمان سے ٹپکے تو اسی میں آ کر اٹکے ہیں۔

ایک بار پرانے زمانے کے ہیڈ ماسٹر ٹیگور کے ساتھ ادھر آ نکلے تو کچھ حیران ہوئے اور کچھ ان کے احساس خود پسندی کو بھی ٹھیس پہنچی، مدرسے کے ہیڈ ماسٹر یعنی دنیائے اسکول کے دیوتا تو زمین پر اور ایک ننھا شیطان درخت

پر اس طمانیت سے بیٹھا ہے گویا پھوٹا ہی اس شاخ سے تھا، اہانت اور دنیائے تعلیم کی اس قدر کھلی اہانت! اگر ٹیگور ہمراہ نہ ہوتے تو ایک مرتبہ تو ہیڈ ماسٹر ضرور جادو کی وہ چھڑی گھماتے جس سے آناً فاناً اوپر والا گستاخ نیچے اور نیچے والے اوپر ہوتے۔ جی میں تو بہت آیا مگر کیا کرتے۔ ٹیگور کی طرف جھنجھلا کر بولے، کہیئے حضرت یہ ہے آپ کے ضبط کا حال۔ بولے کیا یوں کہیئے کہ باقاعدہ جواب طلب کر لیا۔ ٹیگور بولے جناب۔ بچپن کا زمانہ ہی انسان کی عمر کا وہ دور ہے جب وہ اپنی مرضی سے جی چاہے تو ڈرائنگ روم کی سخت کرسیوں پر اکڑا اور جکڑا بیٹھا رہے یا ٹہنیوں کے جھولے میں فطرت کی گود میں ہلکورے لے، یہ سچ ہے کہ مجھے بچپن میں اس پیدائشی حق سے محروم کر دیا گیا تھا مگر کیا میں ان بچوں سے ان زیادتیوں کا بدلہ لوں اور اُن کا یہ حق غصب کر لوں۔

لطف یہ کہ یہی اُستاد اپنے مدرسہ میں علم نباتات کے مطالعہ پر خاص زور دیتے ہیں، ان کے اسباق کا محور ایک کھلتی ہوئی پھلواڑی، فضا میں تیر کی طرح پیر جانے والا پرندہ نہیں۔ ان کا مرکز تو اس پرندے کا ایک مٹی کا مجسّمہ یا اس درخت کا ایک سوکھا ہوا اور کاغذ پر چپایا ہوا پتّہ ہے۔ یہ لوگ اس بے روح معلومات پر تو یوں جان چھڑکتے ہیں، اور نباتات کے اس ذاتی تجربہ سے یوں گریزپا ہوتے ہیں۔ یہ فطرت سے گھبراتے ہیں، اور دور ہی سے اشارہ

سے کہتے ہیں دیکھنا قریب نہ آنا ذرا دور ہی رہو ہم یہیں سے مطالعہ کریں گے قریب آئے تو اچھا نہ ہوگا۔ شانتی نکیتن کا بچہ فطرت سے اِتنا بیگانہ نہیں وہ ہر درخت کو اس انداز سے دیکھتا ہے گویا اُس نے کوئی پُرانا دوست نئے جنم میں دیکھ پایا ہے۔ ہر تنے میں جو پاؤں رکھنے کی جگہ دیکھتا ہے اُس کے لئے وہ پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں۔ یہ تو درخت نے اُس کی خیر مقدم کے لئے اپنا دامن پھیلایا ہے کہ آؤ میرے نیچے آؤ اور مجھ سے لپٹ جاؤ۔

تعلیم کے قلمی پودے

ہمارے مُلک کے چیدہ اچھے مدرسے اچھے ہیں اور بہت اچھے۔ ہم انھیں فخر سے دوسری قوموں کے سامنے پیش کرسکتے ہیں لیکن ایک ملک کا پورا نظامِ تعلیم چند ایک اچھے مدرسوں سے نہیں بن سکتا۔ یہ ادارے تو تاڑ کے اُن اونچے درختوں کی طرح ہیں جن کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں مگر اُن کے دامن میں ابھی تک سموم صفت ہوائیں چل رہی ہیں اور اس میں وہ نازک اور کمزور پودے مُرجھا رہے ہیں جن میں اُن تاڑ کے درختوں کا قلم بھی نہیں لگ سکتا، کاش کہ کوئی تعلیمی وجد ایسی ایجاد پیدا کرتا کہ ہم شانتی نکیتن یا جامعہ ملیہ کی قلم دوسرے پودوں میں لگا سکتے۔

اچھے مدرسے میرے خیال میں دو قسم کے ہو سکتے ہیں ایک ...

قلم لگ سکتی ہے اور دوسرے وہ جو اس کام کے نہیں ۔ ٹیگور کا کام تعلیمی دُنیا کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے ۔ ہمارے سر اُن کی خدمات کے اعتراف سے جُھک جاتے ہیں مگر ایک حد تک ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا ہو گا کہ اُن کا پودا قلمی نہیں کیونکہ یہ علم تو اس کا لگانے والا اپنے ساتھ لے گیا ۔ کوئی دوسرا ایسا فطرت کا راز داں بچے کی ضروریات کا ترجمان پیدا ہو تو ویسا ادارہ بنے ۔ بالعموم ان اداروں میں جو کسی فرد کی نگاہِ بلند کا نتیجہ ہیں ۔ قلمی ہونے کی صلاحیت ان اداروں سے کم ہے جو ایک قومی اور اصلی تحریک کی طبعی پیداوار ہیں ۔

ایک قوم کا تعلیمی معراج یہی ہے کہ اس کی معمولی روزمرّہ کی زندگی میں وہ رو دوڑتی ہوئی نظر آئے ۔ فطرت کے وہ اَن دیکھے پیغامات اس کی فضا میں تیر رہے ہوں کہ روز معمولی حالات میں معمولی اُستادوں کے ہوتے ہوئے بھی اس کے مدرسے اچھے مدرسے ہوں ۔

تعلیمی معجزہ

کسی نے کہا ہے حقیقت ایک افسانہ سے زیادہ غمگین ایک ناول سے زیادہ رومانی ہو سکتی ہے اور زندگی کے معجزے تو ہر ایسے وقت ہوتے رہتے ہیں ، جب اُن کی مطلق توقع نہیں ہوتی ۔ کیا یہ معجزہ کسی سے کم ہو کہ ہماری زمین فضائے بسیط میں ایک ہندوستانی بازی گر کی طرح ہزاروں میل فی گھنٹہ کی رفتار

سے گھوم بھی رہی ہے اور آگے بھی بڑھ رہی ہے اگر وہ اپنی حرکت میں ایک سکنڈ کے کروڑ ویں حصے کی برابر بھی غلطی کر دے تو نہ یہ لکچر یہاں ہو رہا ہو اور نہ ہم یہاں ہوں۔

ہمارا کمال تو یہی ہے کہ معمولی حالات میں ہمارے اُستاد معمولی مدرسوں کو اچھے مدرسے بنا دیں۔

تعلیمی ولولے کے محرکِ خارجی

ایسا اُستاد جو ایک ٹیگور یا ذاکر حسین جیسی شخصیت کے ساتھ کام کرتا ہے ہمارے لئے باعثِ رشک ہے۔ قدرت نے اسے گراں قدر عطیہ ایک بڑا موقعہ بخشا ہے۔ اسے ایک ایسا حق حاصل ہے جس پر ہم سب رشک کریں لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ یہ موقعے ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہوتے۔ اور نہ ہر شخص اس کا اہل ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی ایسی انقلاب آفریں ہستیاں ہمارے ملک میں زیادہ تعداد میں پیدا ہونے لگیں، ہو سکتا ہے کہ اُن کی قندیلِ علم سے ایک چنگاری ہمارے سرد مہر تعلیمی انسپکٹروں اور تعلیمی نسق کے دوسرے اجارہ داروں کے خرمنِ حیات میں جا پڑے۔

لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ کام کا یہ شوق اور ولولہ ہمیشہ ایک خارجی سبب کا مرہونِ منت رہے گا، ایسے حالات میں اُستاد ایک مشین کا پرزہ ہو گا

مشین بہت شاندار ہو گی پُرزہ بھی بہت پُر عظمت ہو گا۔ مگر ہو گا پُرزہ۔ اس کو حرکت میں لانے والا۔ اس کے جذبۂ فعالیت کو اُبھارنے والا محرکِ خارجی ہو گا۔ مگر ایک اچھے مدرسے کے بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا اُستاد بذاتہٖ ایک ایسا بجلی گھر ہو جس سے بجلی کی رو ہیں مختلف سمت دوڑ کر مدرسے کے پورے کارخانۂ عمل کو خاموش مگر تیز یا رفتارِ زندگی سے متحرک کر دیں۔ وہ ایک محکمۂ تعلیم کی ہدایات کا ایکسچینج (EXCHANGE) اور حکومتی نظام کے احکام کا تقسیم کرنے والا مرکز نہ ہو۔

کاش! یہ ذاتی یا شخصی زندگی کا اصول ایک قومی تحریک کی حیثیت اختیار کر لے۔

کاش ہمارے ملک میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جو اُستادوں میں اس جذبہ کو عام اور عوام میں اسے ہر دلعزیز بنا دیں۔ جرمنی کے اس معلم کی طرح جو کہا کرتا تھا کہ اگر مجھے اس کا ڈر نہ ہو کہ لوگ مجھے سڑی سودائی سمجھیں اور پاگل خانے میں بند کر دیں تو میں ننگے سر ننگے پاؤں جرمنی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاگتا پھروں اور چلا چلا کر اعلان کرتا پھروں کہ میرے ہموطنو! آؤ اور آج سے نئی نسل کی تعلیم کا کام شروع کر دو۔ یا پھر خدا کرے ہمارے ہاں روسو جیسے آتش مقال مصنف اور زندہ جاوید مفکر پیدا ہوں جس کی تحریروں کو جب پیرس کی بانکی سجیلی اور فیشن کی پرستار عورتوں نے پڑھا تو ناچ گھروں میں

اپنے مرد ساتھیوں کو تنہا چھوڑ دیا۔ فلیشن ایبل ایوانوں کو سونا کر دیا اور ایک مرتبہ پھر اپنے اُجڑے گھروں کو بسایا اور اپنے بچوں کو گلے سے لگایا اور اُن کی تعلیم کا کام ایسی تن دہی سے شروع کر دیا کہ گویا یہ بھی کوئی پیرس کا نیا فیشن تھا یا پھر کرسچین کولڈ کی طرح جس نے اپنے پیارے وطن ڈنمارک سے دور زندگی کے عزیز سال صرف کر کے تھوڑی سی پونجی جمع کی اور یورپ بھر کا پاپیادہ سفر کرتا ہوا واپس پہنچا تاکہ اس حقیر رقم سے ڈنمارک کے کسانوں کے لئے ایک مدرسہ کھولے۔

پُرانا نظامِ تعلیم

ان مثالوں کے لئے ہمیں سات سمندر پار جانے کی ضرورت نہیں ہمارے ملک میں نسلاً بعد نسلاً اُستادوں نے ایسی پیشہ ورانہ روایت قائم کر دی ہے جس نے اصل معنوں میں ہندوستان کو علم و حکمت کا گہوارہ بنا دیا تھا بقول ایک انگریز مصنف کے ان لوگوں نے خاموش کٹیاؤں، گمنام مسجدوں کے گوشوں میں دور افتادہ مدرسوں کے ایوانوں میں علم کی قندیلیں روشن کی تھیں۔ جب غربت و افلاس کے جھکڑ ان کے گرد چل رہے تھے۔ مجھے اس پر عرب کے اس مشہور نحوی کا قصہ یاد آگیا جو اس زمانہ میں اپنے فن کا امام تھا۔ کہتے ہیں کہ جب امیر اہو ملذ نے اُسے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے پیام بھیجا تو وہ گھر کے اندر کھانا کھا رہے تھے، جَو کی سوکھی روٹیوں کو پانی سے نگلنے میں دیر تو

ضرور لگتی ہے۔ قاصد باہر کھڑا اُکتا گیا تھا سے تو شاہی فرمانوں کی تعمیل میں مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ اتنے میں آپ جلدی سے اٹھے، دسترخوان پر نگاہ کی تو ایک روکھا ٹکڑا بچا ہوا تھا وہی ٹکڑا ہاتھ میں اٹھا کر نکلے اور قاصد کو دکھا کر کہنے لگے بھائی امیر سے جا کر اتنا کہہ دینا کہ جب تک مجھے دو وقت یہ نانِ جویں میسر آتی ہے مجھے تمہارے دروازے پر آنے کی ضرورت نہیں۔

یہ افسانے سب ہی سچ سہی۔ یہ روایات کتنی درخشاں سہی لیکن کیا ہم ان گزرے ہوئے زمانوں کو لوٹا سکتے ہیں۔ کیا ہم ان شاندار روایات کو دوبارہ زندہ کر سکتے ہیں، یہ کام اتنا سہل نہیں اُستاد تو ایک مرتبہ پھر ان روایات کو دہرا سکتے ہیں ان روایات کو دوبارہ زندگی بخش سکتے ہیں، لیکن کیا سماج کے موجودہ حالات اُنھیں ایسا کرنے کی اجازت دیں گے۔ اگر ایک جانب اُستاد یا شاہِ وقت کے قاصد کے سامنے روٹی کے سوکھے ٹکڑے کو ایسے لہرا سکتا تھا جیسے ایک بہادر اپنے ٹوٹے ہوئے پھریرے کو صبح کے وقت لہرا رہا ہے۔ اگر ایک جانب اُستاد اکبر جیسے صاحبِ سطوت و جبروت شہنشاہ کو ڈنڈے سے سزا دے سکتا ہے تو دوسری جانب سماج بھی ایسی تھی جو اُستاد کی ضیافتِ علم پر ہی نہیں بلکہ اس کے ڈنڈے کی دعوت پر بھی لبیک کہنے کو تیار تھی، یہ سماج اُستاد کی اتنی قدر کرتی تھی جواب تک نہ پہلے کبھی کی گئی اور نہ کی جائے گی ــــ جودھ پور کے عالمِ وقت مولانا شہاب الدین دولت آبادی بیمار پڑتے ہیں تو بادشاہِ وقت خود اُن کی عیادت کو آتا ہے اور پانی کا بھرا ہوا پیالہ

تین بار اُن کے سر پر سے پھرا کر پیتا ہے اور دُعا مانگتا ہے کہ الٰہ العالمین جو آفتِ ارضی وسماوی آج ان کے سر پر آئی ہے ٹل جائے۔ میں اس بلا کو دونوں ہاتھوں سے خوش آمدید کہنے کو تیار ہوں، ایک وہ بھی زمانہ تھا کہ اُستاد کے لئے جی چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے لیکن اب تو دل کی جگہ بل نے لے لی ہے اور تعلیمی عمل نے اچھی خاصی کاروباری حیثیت اختیار کرلی۔

لیکن اچھے مدرسے جب ہی ہوسکتے ہیں کہ اُن میں اچھے اُستاد ہوں اُستادوں کے ساتھ ساتھ اچھے والدین بھی ہوں، اچھے والدین سے ہماری مراد یہ نہیں کہ وہ فرشتہ ہوں۔ اتنا ضرور ہو کہ انھیں استاد پر پورا پورا اعتماد ہو۔ پورا نہیں تو کم ازکم اتنا کہ وہ سمجھیں کہ اُستاد کے دل میں بچے کی بھلائی کا خیال ہے۔

ہمارے دیس میں والدین نے اُستاد کے ان حقوق کا بہت احترام کیا ہو ماں باپ نے یہ حق الخدمت ادا کیا اور خوب کیا اور اُستادوں نے بھی پٹائی کا فرض خوب خوب انجام دیا اور اکثر اس خوبی سے دیا کہ اس قضیہ کو ہمیشہ ہمیش کے لئے نپٹا دیا۔ نہ مرض رہا نہ مریض!

کہتے ہیں کہ سندھ کے بادشاہ ناصرالدین قباچہ نے اپنا بیٹا مکتب میں بٹھایا اور لوحِ سیمیں تو اس کی پہلو میں رکھی ہو یا نہ رکھی ہو، لیکن ایک اُستاد سنگین اس کے سامنے لا بٹھایا۔ ملاجی شہزادے کے دماغ کو خوب ٹھونک ٹھونک کر

بھر دینا چاہتے تھے اور اتنا کچھ بھرنا چاہتے تھے جو اس کی کھپت سے زیادہ تھا۔ اگر ہم چینی کے نرم و نازک مرتبان میں ٹھس ٹھس بھرنا چاہیں اور بھر کر لگیں موسل سے ٹھونسنے تو نتیجہ ظاہر ہے، مرتبان میں محض بال ہی نہیں آئے گا بلکہ وہ پاش پاش ہو جائے گا۔ استاد کی مار سے شہزادے کے دل میں بال ہی نہیں آیا، بلکہ وہ حقیقت میں پاش پاش ہو گیا۔ شہزادہ کا دل نہیں بلکہ خود شاہزادہ! شہزادے کی لاش سامنے پڑی تھی اور وہ اندھیرا جو اب تک اُن کے دل و دماغ پہ چھایا تھا اُتر کر آنکھوں کے تلے آگیا۔ شاہی مکتب میں شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے کو کسی نے یہ خبر بادشاہ تک پہنچائی۔ جھٹپٹے کے وقت بادشاہ دبے پاؤں مکتب میں آیا ملاّ جی کو دیکھا تو منہ پھیر لیا، ایک ہاتھ میں اشرفیوں کا توڑا تھا اُسے بڑھا کر کہنے لگا یہ زادِ راہ سنبھالو، مکتب کے باہر شاہی اصطبل کا سب سے سبک رفتار گھوڑا کھڑا ہے اس پر اپنے وطن کی راہ لو اور راتوں رات میری مملکت کی سرحد سے باہر نکل جاؤ۔ اگر ملکہ کو پتہ چل گیا تو ایک ماں کے جذبۂ انتقام سے تمہیں ایک بادشاہ کی قوت بھی نہ بچا سکے گی۔

تو صاحبو! ہمارے ملک میں ایسی پٹائی بھی کرنے والے تھے، اور ایسی پٹائی کی داد دینے والے!

نیا نظام

لیکن آج کل تو زمانہ اُستاد سے مار کھانے کا نہیں بلکہ ایک حد تک اُستاد کو مار کھلانے کا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ سماج نے جیسے آج تک اُستادوں کے ہاتھوں پٹتی آئی تھی ایک سنبھالا لیا اور ایک خطرناک ردِ عمل شروع کر دیا۔ گویا کہہ رہے ہیں کہ بہت پٹ چکے، اب تمہاری باری ہے۔ آج مدرس کے کانوں میں ہیڈ ماسٹر کی تنبیہہ اس کے ہاتھوں پر ایجوکیشن کوڈ کے بندھن پڑے ہوئے ہیں وہ قانوناً کبھی بچہ کو نہیں مار سکتا۔ اور وہ والدین جو آج کل بچوں کی تعلیم سے اتنی دلچسپی کبھی نہیں لیتے جتنی اپنے کتوں اور بلّوں کے کھلانے پلانے میں۔ جب کبھی بلّوں کو چھوڑ کر تعلیم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو تعلیم تو نہیں کم از کم اُستاد پر تو پل ہی پڑتے ہیں۔

نئے والدین

اب تو لوگوں پر بالعموم ایک مادّی اور اقتصادی ذہنیت طاری ہے اُستاد پُرانے زمانے کا وہ گورو یا معلّم نہیں رہا جس کی خاکِ پا کو سُرمہ بنایا جاتا، اب وہ مدّت سے دوسرے پیشہ وروں کی طرح ایک پیشہ ور ہے جیسے ہم لکڑی کا ایک گانٹھوں سے پٹا ہوا بے قطع لٹھا بڑھئی کے پاس لے جاتے ہیں اور

اس میں سے ایک خوش وضع میز یا سنگھار دان بنانے کو کہتے ہیں اور اس کے ساتھ احتیاطاً یہ بھی "کہ ہاں بناتے ہوئے خیال رکھنا کہیں لکڑی میں شگاف نہ آجائے۔"

اسی طرح اکثر والدین بھی استاد کے ساتھ یہی کچھ کرتے ہیں کہ بچے کو لاکر مدرسہ میں پٹک دیتے ہیں، بچہ کیا ہوتا ہے اچھا خاصہ کسی بھٹ سے نکلا ہوا جانور ہوتا ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ استاد دیکھتے دیکھتے اسے الف لیلیٰ کے جادوگر کی طرح جیسا ان سے انسان بنا دے، استاد کے پاس کوئی ایسا ہتھیار نہیں جو اس شرارتوں کی پوٹ کو چھیل چھیلا رندہ کر کے خراد پر چڑھا ایک بڑھئی کی طرح والدین کے حوالے کر دے کہ جناب یہ لیجئے آپ کی چیز کیسی رنگین و حسین بنا کر واپس کر رہا ہوں۔

اکثر والدین تو اس چھلائی اور رندائی کی تاب نہیں لا سکتے۔ اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ ان کے لئے تو ان کا نتھا وہ معصوم فرشتہ ہے جو نور کے بادل اڑاتا ہوا ان کے گھر نازل ہوا ہے لیکن بچے اپنے پاؤں سے نور کے بادل ہی نہیں اڑاتے اکثر گرد و غبار اور دھول بھی اڑاتے ہیں، ہم نے تو بچوں کو اکثر اسی دھول میں اٹا دیکھا ہے، اگر یہ تو نگاہ کا قصور ہے۔ وہ ہم کو جو دھول معلوم ہوتی ہے ان کے والدین کے لئے سراسر نور ہے۔ اور اگر وہ دھول کے ماننے پر مجبور ہو گئے بھی تو اتنا کہیں گے کہ یہ دھول ان کے بچے کی اڑائی

ہوئی نہیں بلکہ کسی اور کی اُڑائی ہوئی ہے۔

ایک مرتبہ ایک دادی اماں اپنے پوتے کو مدرسے میں داخل کرانے آئیں اللہ آمین کا بچہ پورا گھر داری صدقے ہوتا تھا۔ یہ بھی اُن کی عنایت تھی کہ پیدل تشریف لائے ورنہ دادی اماں ان کی سواری کو ہر وقت موجود۔ اُستاد کے پاس پہنچیں تو پوتے کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔ بیٹا للّو کے سر کو تم نے دیکھا بڑا عجیب و غریب دماغ پایا ہے ہم نے ایک دفعہ ایک قیافہ شناس کو دکھایا تھا، بولا بڑے دل و دماغ کا لڑکا ہے۔ اُستاد کچھ حیران ہو کر پوچھنے لگا بڑی اماں اور کچھ بتایا تھا۔ دادی اماں بولیں سب ہی کچھ تو بتا دیا، ہاتھ کے خطوط دیکھ کر کہنے لگا کہ بس (انگوٹھے اور بیچ کی انگلی سے دائرہ بنا کر) اتنی سی کسر رہ گئی ورنہ تو یہ لونڈا سقراط سے ٹکراتے ٹکراتے بچ گیا۔ اور ہاں ایک بات تو بتانا بھول ہی گئی۔ اس نے کہا کہ جس ساعتِ سعید میں یہ پیدا ہوا تھا اس میں بدی دسٹر کے سب ہی تو ستارے اوندھے ہو گئے تھے تو بیٹا ہم نے یہ سب باتیں تمھیں ابھی سمجھا دی ہیں، آئندہ اگر کسی نے اس کی شکایت کی تو یوں جانو کہ اُس سے بُرا اور کوئی نہیں۔

یہ ذہنیت اکیلی اس دادی اماں کی نہیں بلکہ اب تو پوری سماج کی ہو چلی ہے۔ اب کوئی بتائے کہ اُستاد ایسے میں کیا کرے۔ اپنا سر پیٹ لے یا کسی قیافہ شناس کا منھ نوچ لے۔ ہندوستانی والدین میں بہت خوبیاں ہیں

لیکن اس کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہیں اور سب سے بڑی خامی تو یہی
ہے کہ وہ اپنے بچے کو یا تو سراسر فرشتہ سمجھتے ہیں یا پھر نرا گدھا۔ اب اگر بچہ
فرشتہ ہے تو استاد نے کسی ایسے ٹریننگ کالج میں تعلیم نہیں پائی جس میں فرشتوں
کو تعلیم دینے کے طریقے سکھائے جاتے ہوں۔ اس قسم کے معلم تو شاید دوسری دنیا
میں پائے جاتے ہوں گے۔ ان حالات میں والدین کو یہی ہدایت کرنے کی ضرورت
ہے کہ وہ ایسے معلّمین کی تلاش میں یا تو خود دوسری دنیا کا سفر کریں یا ہو سکے تو بچے
کو وہیں بھیجیں یا اس کے بعد رہی دوسری قسم تو گدھوں کی تربیت کے لئے اب تک
کوئی استادوں کا مدرسہ قائم نہیں کیا گیا انسان تو ابھی تک اپنی نفسیات کی الجھنوں
سے ہی کہاں فارغ ہوا جو ان مسائل پر توجہ دے سکے۔

نفسیات اور تعلیم

پھر بھی اگر آپ نے نفسیات صحیح طریقے سے پڑھی ہے تو آپ مدرسے کی
دنیا میں اس سے بہت کام لے سکتے ہیں۔ مدرسے کے اندر ہی نہیں بلکہ اس
کے باہر بھی۔ آپ نے کامروپ کے جادو کا نام ضرور سنا ہوگا وہ جادو جس
کے ذریعہ لوگ کسی کو مینڈھا بنا دیتے تھے اور کسی کو گینڈا۔ لیکن اس کے
لئے آپ کو قصوں کہانیوں کی دنیا میں جانے کی ضرورت نہیں۔ امام
غزالی اپنی کتاب احیاء میں فرماتے ہیں کہ ہر انسان میں ایک شیر ایک سور

خدا جانے کیا کیا چھپا ہوا ہے۔ لیکن اب جو ماہر نفسیات نے اپنے
آئینہ جہاں نما میں سے نظر کی تو اُسے بھی انسان میں بھی خدا جانے
کیا کچھ شیر بھیلے پوشیدہ نظر آئے۔ انسان کیا تھا اچھا خاصہ چڑیا گھر بنا
ہوا تھا، کسی کے ہاں درندوں کی فراوانی تھی، کہیں چرند پرند زیادہ تھے
لیکن انھیں ہر جگہ ایک لمبے کانوں اور دُم والا جانور ضرور نظر آیا۔

دیکھئے کہیں آپ سر کو سینہ پر جھکا کر اُسے دیکھنے کی کوشش نہ کریں
میں آپ کی شان میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتا۔ لیکن ممکن ہے وہ جانور آپ کے
ہاں بھی موجود ہو مگر آپ اسے دیکھ نہیں سکتے وہ تو اکثر دوسروں کو ہی نظر آتا ہے
یہ دوسرا شخص کوئی سمجھ دار آدمی ہو اور اسے اس جانور کے لمبے لمبے کان نظر
آجائیں تو وہ آپ سے جو کام چاہے لے سکتا ہے۔ یہ سمجھ دار لوگ نئے یگ کے
کامروپی جادوگر ہیں اگر آپ بھی یہ علم حاصل کرنا چاہتے ہیں، آپ بھی الف لیلیٰ کو
وہ آئینہ لینا چاہتے ہیں جس میں دل کا حال یوں اُترتا ہے جیسے ایک پری شیشے
میں تو آپ نفسیات کا علم پڑھیئے۔

نفسیات اور زندگی

ایک اچھے مدرسے میں اور ایک اچھے اُستاد کے لئے نفسیات کی
ضرورت ہے، نفسیات کی بھلا کہاں ضرورت نہیں ؟ سب ہی جگہ ضرورت

ہے سب ہی لوگوں کو ضرورت ہے نفسیات کو بعض لوگ تو علم النفس کہتے ہیں اور کئی کئی نام رکھتے ہیں لیکن میرے خیال میں تو یہ علم سیدھے سادھے الفاظ میں یہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو سمجھے پھر دوسروں کو بھی سمجھے اور یہ سمجھ ہمیں انسانی کاموں کا بہتر انداز میں انجام دینے اور انسانی تعلقات کو بہتر بنانے میں امداد دے۔ آدمی اپنے آپ کو سمجھے اور دوسروں کو بھی سمجھنے کی کوشش کرے۔ ہم استاد اکثر اپنے اوپر تو غور و فکر کرتے رہتے ہیں اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ انسان دوسروں کو بھی سمجھنے کی کوشش کرے۔ مادی لحاظ سے تو اپنے آپ کو سمجھنے میں سراسر نقصان اور دوسرے کو سمجھنے میں سولہ آنہ فائدہ ہے۔ آج کل کے تمدن میں لوگ اس سے بڑے بڑے فائدے اٹھاتے ہیں۔ دوسروں کو سمجھئے اور فائدہ اٹھایئے ذرا صابن کے ایک اشتہار پر نظر دوڑایئے کیسی دلکش حسینہ صابن کی ٹکیہ لئے ایک تبسم کے ساتھ آپ کو خوشامدید کہہ رہی ہے۔ اگلے دن آپ سیدھے بازار پہنچتے ہیں ذہن پر ایک رنگین کہر چھایا ہوا ہے، اس میں وہ سب ہی رنگ جھلک رہے ہیں جو حسینہ کی ساڑھی کے حاشیہ پر لکھے جاتے ہی اس صابن کے ڈبے کا آرڈر کر دیتے ہیں کوئی پوچھے اس ڈبے کے خریدنے سے کیا آپ کو اسی ڈبہ میں لپٹی لپٹائی اشتہار والی وہی حسینہ مل گئی ہے ہاں ایک بات ضرور ہے صابن تیار کرنے والے سرمایہ دار نے آپ کی نفسیات کو

خوب سمجھا ہے اک بھوکے جنسی میلان کو تاڑ لیا ہے اور اس کا فائدہ اُٹھا کر گاہک
کو سمجھا ہی نہیں لُولُو بھی بنایا ہے۔

لُولُو بنانے کا کام ہمارے ملک میں اور دوسری جگہ بڑے پیمانے پر
جاری ہے ایک بڑا لیڈر پلیٹ فارم پر آتا ہے وہ اپنے سامعین کی نفسیات
کو خوب پہچانتا ہے اور ان سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ ایک اچھا دوا فروش اسی
کی برکت سے خاک کی چٹکی کو اکسیر کے بھاؤ بیچتا ہے۔ ہم روزانہ کی تعلیمی زندگی
میں دیکھتے ہیں کہ ہمارے بعض ساتھی انسپکٹر یا ہیڈ ماسٹر لوگوں کو کیسے بات ہی بات میں
پا جاتے ہیں ان کی خوبیوں کو۔ اور یہ لوگ جو دوسروں کا قافیہ تنگ کر دیتے ہیں ان قیافہ
شناس لوگوں کے ہاتھ میں موم کی ناک ہو جاتے ہیں۔

خبردار! ۔ مقصد یہ نہیں کہ خدانخواستہ آپ نفسیات کی امداد سے ہر
کسی کو موم کی ناک بنانے لگیں ہمارا مطلب تو یہی ہے کہ آپ اپنی ناک کی خیر
منائیں اور بچوں کو اپنا ناک صحیح سلامت رکھنے میں امداد دیں۔ اور اس کے لئے
نفسیات کا صحیح اور جائز استعمال کریں۔

اور اب تو نفسیات نے ایک سیلاب کی طرح اگر اسکول کی چار
دیواری کو نہیں تو اُستادوں کے مدرسوں کو تو آ ہی لیا اور کیوں نہ ہو اس کی
اصلی ضرورت اس کا بہترین استعمال اس کا جائز ترین مصرف تو مدرسے
کی چار دیواری میں ہی ہو سکتا ہے۔

میرا دل کس قدر چاہتا ہے کہ وہ رنگین پوسٹر جن پر سرمایہ دار لوگ اپنی تجارتی چیزوں کا اشتہار دیتے ہیں۔ جہاں بھی نظر آئیں نوچ کر پھینک دوں ان کی جگہ ایک مریم صفت حسن کی مورت اک ننھی سی جان کو اُنگلی سے لگائے ہوئے ہو اور ملتجی نگاہوں سے کہہ رہی ہو کہ اپنے بچے کی نفسیات کو سمجھئے۔ اس کے برابر ننھا منا سا احمد ایک ایسی ٹوپی لگائے جس کا پھندنا مدت سے غائب ہو چکا ہے موہن سے پوچھ رہا ہو کیوں بھئی جیسا ہم تمہیں سمجھتے ہیں تمہارے لالہ بھی ہمارے ابا کو سمجھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ نفسیات کے صحیح استعمال سے مدرسوں کے نہیں ہمارے ملک کے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے سیاسی اور سماجی مباحثوں کو کسی نفسیاتی کٹھالی میں ڈال کر تاؤ دیں تو یہ سب دھواں بن کر اُڑ جائیں گے اور اس کی تہ میں یا تو ذاتی چشمک کی تلچھٹ ہو گی یا اقتصادی تفرقے کی ریگ۔

لیکن بچارے اُستادوں کو ان بڑے مسائل سے کیا واسطہ۔

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

وہ تو ان سیاسی سانڈوں کی ٹکریں اپنے تعلیمی گھروندے کی خیر منائیں اور ان کے ٹوٹے پھوٹے ایوان تعلیم کے لئے دو کی بھی ضرورت نہیں ایک ہی نے ذرا سینگ اُچھال دئے تو اُستاد اور اس کا گھروندا، دونوں فرش راہ ہو جائینگے

اور پھر آخر تعلیم ہے بھی ایسی کونسی اہم چیز۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اک قومی مجلس میں
سب ہی مسائل طے ہو چکے اور لوگوں نے چلنے کے لئے جوتیاں سنبھالیں تو
سکریٹری نے ایجنڈا پر چھلکتی ہوئی نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ حضرات اور تو سب
کچھ طے ہو گیا اک فروعی مسئلہ قومی تعلیم کا رہ گیا معلوم نہیں لوگوں نے اس بات
پر پہلے جوتیاں اُٹھائیں یا تعلیم کا مسئلہ اُٹھایا۔ بہرحال اس سے ایک بات صاف
ہوگئی کہ ہمارے لیڈر تعلیمی مسائل سمجھنے میں کس قدر دلچسپی سے کام لیتے ہیں۔

بہرحال وہ لوگ سمجھیں یا نہ سمجھیں ہمیں خود تو اپنے مسائل کو سمجھنا ہے
ان سب مسائل میں سے نفسیات کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔ اپنے آپ کو سمجھیں
بچے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ماں باپ پر نفسیاتی نگاہ دوڑاتے رہیں سا تھیوں
کی نفسیاتی دیکھ بھال کریں۔ آپ بھی کہیں گے کہ نفسیاتی جانچ نہ ہوئی۔ بھڑوں
کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ جسے دیکھا ایک نفسیاتی نشتر بھونک دیا جس کا منھ کھلا پایا
ایک نفسیاتی تھرمامیٹر لگا دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک اچھا مدرسہ ہی نہیں بلکہ
ایک اچھی زندگی بنانے کے لئے ہمیں یہ سب کچھ کرنا ہوگا۔

ایک اچھے اُستاد کے لئے سب سے پہلے خود اپنے نفسیاتی مشاہدہ
اور تجزیہ کی ضرورت ہے۔ فرض کیجئے آپ کسی بات پر سخت بھنا رہے ہیں۔
نتھنے پھیلے ہوئے۔ رگیں پھولی ہوئی۔ بقول سرسید جبڑے چڑ کر کانوں تک لگے
ہیں۔ ایسے میں کوئی دفعتہً ہمارے سامنے ایک آئینہ لاکر رکھ دے تو شاید اپنے

آپ کو دیکھ کر مسکراہٹ نہیں، اپنے اوپر ایک بے ساختہ قہقہہ مارنے کی خواہش غالب آ جائے۔ اپنے آپ پر بے سمجھی میں ہنس لینا انسان کی فتح ہے اور سمجھ بوجھ کر ہنس لینا تو سب سے بڑی فتح ہے اور اگر ہم یہی آئینہ دوسروں کو بھی دکھا سکیں تو یوں سمجھو ایک میدان نہیں کارزار زندگی کے بہت سے میدان مار لئے۔

اس موقعہ پر مجھے بار بار اپنے ایک طالب علم کی یاد آ رہی ہے جب وہ پہلے پہل میری جماعت میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور کچھ دنوں کے بعد مجھے پتہ چلا کہ یہ وقتی نہیں بلکہ مستقل تھیں۔ اس کا رنگ ہمیشہ اُڑا اڑا سا رہتا تھا زرد۔ کھویا کھویا سا کردار ہیں توازن کی کمی گفتار میں ہم آہنگی کی۔

وہ لڑکوں سے پریشاں اور گریزاں رہتا تھا اور لڑکیوں کو دیکھ کر تو یوں معلوم ہوتا تھا گویا اس کی زندگی کی طنابیں ٹوٹنے والی ہیں اور وہ اس کی زنجیروں سے چھوٹ کر کہیں دُور ہمیشہ کے لئے چھپ جانا چاہتا ہے۔ وہ نفسیات پر اور دوسرے لکچر غور و فکر سے سنتا رہا پھر وہ چھٹیوں میں گھر چلا گیا اور واپس آیا تو وہ اک اور ہی انسان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک اس کے چہرے پر اک تازہ شادابی تھی، وہ کہنے لگا کہ نفسیات کے مطالعہ نے میری نگاہوں سے نہیں میرے ذہن پر سے کئی ایک پردے اُٹھا دئے۔ میں بچپن سے کھویا کھویا رہنے لگا تھا۔ اس کا سبب نہ میں جانتا تھا نہ میرے خاندان والے لیکن اب

نفسیات کی روشنی میں جو ماضی کے دھندلکے پر غور کرتا ہوں تو کئی ایک نقوش نظر آتے ہیں اور ایک جو ان میں سے ایسا ہے جو ایک دہکتی ہوئی لوہے کی سلاخ کی طرح میری شخصیت میں بھونک دیا گیا ہے۔ مجھے ہلکا ہلکا سا یاد ہے کہ ایک شام میں اندھیرے تک باہر بچوں کے ساتھ کھیلتا رہا کسی نے جاکر میری ماں سے شکایت کی جب واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اماں جان دو دہکتی ہوئی لوہے کی سلاخیں ہاتھ میں لئے بیٹھی ہیں میں گھر میں داخل ہوا تو مجھے ایک بھیڑ کی طرح بچھاڑ کر کہنے لگی تو ان آنکھوں سے بچیوں کو تکتا ہے۔ آج میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان سلاخوں سے تیرے دریچے بند کردوں گی۔ یہ سلاخیں میری آنکھوں میں نہیں دل میں بیٹھ گئیں۔ وہ دن اور آج کا دن میں اپنی شخصیت کی نرم و نازک ہم آہنگی کو دوبارہ نہ پا سکا۔ وہ تو بھلا کرے خدا نفسیات کا جس کی امداد سے یہ حقیقت لاشعور سے شعور میں آگئی۔ اب کے جو گھر گیا تو خاندان والے مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہنے لگے نہیں کون ایسا پیرو مرشد مل گیا جس نے عمر بھر کی گھتیاں دنوں میں سلجھا کر رکھ دیں۔ یہ پیرو مرشد نفسیات کا علم تھا۔ اسے اگر پڑھا جائے تو بے حد تلخ ہے اور اگر عمل میں لایا جائے تو نہایت شیریں۔ مجھے ڈر ہے کہ آپ کو نفسیات کے کئی ایک تلخ جرعے پہلے دئے جا چکے ہیں اور ان کا مزہ آپ کے منہ سے اب تک نہ گیا ہوگا اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے گریز کرتا ہوں

تعاون

اکثر سماجی اور سیاسی انقلاب ایک طوفان کی طرح قوموں کو آلیتے ہیں۔ ان کے بچے بوڑھے سب ہی اس رَو میں بہہ نکلتے ہیں۔ اس کے جھکڑوں سے سماجی ایوان کے پُرانے دیمک خوردہ درودیوار جھڑ جھڑاتے ہوئے نیچے آرہتے ہیں اور اُستاد کا کام اس ایوان کو دوبارہ اُٹھانا ہوتا ہے۔ وہ نئے انقلاب کی بنیادیں استوار کرتا ہے۔ زندگی کے نئے دریچوں میں نئی قندیلیں روشن کرتا ہے لیکن ایسے محرکات ایک اُستاد کی زندگی میں کیا، نسلوں کی زندگی میں کبھی کبھار آتے ہیں۔ زندگی کا اصلی آہنگ تو وہ مدہم سرود ہے جو پیہم جاری وساری رہتا ہے۔ ایک مستقل پیہم تب و تابِ آرزو کی متضامن ایک خارجی محرک نہیں بلکہ داخلی زندگی کی ایچ اور مہک ہے۔ ایک اچھا اُستاد ان خارجی محرکات سے ایک حد تک بے نیاز سا ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کی تہوں سے وہ چشمے اُبلتے ہیں جو ایک دریائے شور کو شیریں۔ ایک ویران صحرا کو گلزار بنا دیتے ہیں۔

اگر آج سے سو سال پہلے آپ لندن کی کسی گلی میں جھٹپٹے کے وقت گزرتے تو بہت ممکن تھا کوئی خاتون غلاظت سے بھری ہوئی بالٹی کھڑکی میں سے فعتاً اس صفائی سے پھینکتی کہ آپ کے کپڑے شرابور ہو جاتے۔ اگر آپ کسی تفریح گاہ میں سیر کرتے ہوئے منہ صاف کرنے کے لئے اپنا ریشمیں رومال نکالنا

چاہتے تو ممکن ہے آپ کا محبوب رومال غائب ہو چکا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کا بٹوہ بھی۔ ان چیزوں کو پَر لگا دینے والے کون تھے۔ یہی لندن کے آوارہ بچے جنہیں گانٹھ کترنے اور چوری سکھانے کے لئے پرانے گھاگی قسم کے شاطروں نے لندن کے بعض حصوں میں باقاعدہ اسکول کھول رکھے تھے

آج لندن کے کسی گوشے میں بھی آپ کے کپڑے ایسی ناگہانی دستانہ بازی سے محفوظ ہیں۔ خواہ بمب باری سے اتنے محفوظ نہ ہوں۔ پچھلے سو سال میں جو سماجی اور معاشی انقلاب ولایت میں ہوا ہے وہ ایک خاموش اور دیرپا انقلاب ہے۔ اس نقلاب کے علم بردار نہ تو وہ سیاسی لیڈر ہیں جو پارلیمنٹ میں پرجوش تقریریں کرتے ہیں اور نہ ہی وہ کارخانہ دار جنہوں نے دیہی انگلستان کی صاف ستھری فضا کو دھوئیں سے تاریک کر دیا ہے اس کے علم بردار تو وہاں کے ابتدائی مدرسوں کے اُستاد ہیں جنہوں نے تاریک اور دُور اُفتادہ گوشوں میں، پس ماندہ اور غریب علاقوں میں اپنے خاموش اور پیہم کام سے ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے ایک دن ہماری تاریخ میں بھی ایک زمانہ ایسا آئے گا جبکہ ابتدائی مدارس میں کام کرنے والوں اور بنیادی تعلیم کے کارکنوں کا نام آئندہ کا مورخ ان سنہری حروف میں لکھے گا کہ یہ لوگ ہمارے ہاں کے سماجی اور معاشی انقلاب کے پیش رَو تھے۔ وہ انقلاب جس کی برکت سے ہمارا شہری بھر بانہ ارادہ

پبلک جگہ کو ایک چوکے کی طرح پوتر۔ ایک عبادت گاہ کی طرح مقدس سمجھے گا
ہمارا ہر دیہاتی ہر ضرورت کی جگہ کو جائے ضرور نہ سمجھے گا۔ جبکہ وہ ایک
ریل گاڑی کے غسل خانے میں گھس کر دوبارہ بغیر کسی امداد کے واپس
آسکے گا۔ جب وہ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر اپنی باری کا انتظار کرنا سیکھ جائے گا
ٹکٹ گھر پر ہی نہیں، زندگی میں بھی اپنی باری کا انتظار کرنا سیکھ لے گا اس وقت
ہم کہہ سکیں گے کہ ہم نے حقیقی سوراج پایا ہے!

آپ کہیں گے کہ مستقبل کے یہ جواب کتنے سہانے ہیں۔ اُمیدوں
کے یہ محل کتنے پُر عظمت اور شاندار ہیں! مگر ہم انہیں ایک ریت کی بنیاد پر
استو[illegible]نے کی کوشش کر رہے ہیں اور وہ جھڑا جھڑاتی ہوئی رتیلی بنیاد ہے'
آفت کا مارا سب طرف سے ٹھکرایا ہوا۔ ابتدائی مدرسہ کا اُستاد۔ آپ سچ
کہتے ہیں۔ یہ بنیاد تو بے شک بڑی رتیلی ہے مگر یہ وہ ریت ہے جس میں سیمنٹ کے
نظر نہ آنے والے ذرات ملے ہوئے ہیں جب پانی ملے گا تو یہ ذرات آپس میں
چمٹ جائیں گے اور یہی رتیلی زمین ایک فولادی بنیاد، ایک سنگین پشتہ بن جائیگی
نئی سماج کے نئے ایوان اسی سنگین بنیاد پر تعمیر ہوں گے!"

کیا آپ کے خیال میں وہ سر بفلک تعلیمی ایوان جن کے گنبد آج تہذیب
یافتہ مغرب میں آسمان کو چوم رہے ہیں پہلے پہل ایسی ہی کمزور بنیاد پر نہیں
رکھے گئے تھے۔ انگلستان میں خود میکالے کے زمانے میں ابتدائی مدرسوں کی

کیا حالت تھی۔ ان میں اکثر اساتذہ ایسے تھے جو دُنیا جہان میں کسی کام کے نہ سمجھے گئے تو انہیں تعلیم کے کام کا سمجھا گیا۔ اس شاندار گروہ میں برخاست شدہ پادری ہوٹلوں سے نکالے ہوئے بہرے، فوج کے بھگوڑے سپاہی، جیل کے مغرور ملزم سب ہی شامل تھے۔

انہی دنوں بلجیم میں دیہی مدارس کی تحقیقات ہوئی تو ایک گاؤں میں ایک اُستاد ملا جو دنیا میں کسی کام کاج کے لائق نہ تھا۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ پہلے کیا کرتے تھے جواب ملا کہ سور چراتا تھا او جب گاؤں والوں نے بڑھاپے کی وجہ سے مجھے اس کام کے لئے بیکار پایا تو بچوں کے پڑھانے پر لگا دیا۔

تعلیمی پیشہ کی حیثیت، مہذب ملکوں میں بھی ایک زمانے میں ایسی کچھ خوشگوار نہ تھی لیکن آج ان کی حالت بہت بہتر ہے۔ اگر ہم اس تبدیلی کے اسباب کا گہری نظر سے تجزیہ کرنا چاہیں تو ہمیں اس راز کا پتہ چلے گا جس سے ایک اچھے مدرسہ کا قوام تیار ہوتا ہے اور جس کے بغیر مدرسہ کیا پورے نظام تعلیم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

جس طرح طبعی دنیا میں انرشیا (جمود) کا اُصول جاری وساری ہے۔ اسی طرح سماجی دُنیا میں بھی اس اُصول کی حکمرانی ہے جب تک کوئی خارجی محرک نہ ہو، اس وقت کوئی بے جان شے خود بخود حرکت نہیں کرسکتی اور جاندار شے میں بھی اگر زندہ رہنے کی اُمنگ نہ ہو تو وہ بتدریج حرکت کی برکت سے

محروم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ان ممالک میں پہلے پہل اساتذہ کے حلقے میں ہل چل پیدا ہوئی اس وقت تک یہ حلقے بے جان تھے ان کو زندگی کا احساس ایک خارجی محرک نے دیا وہ کون تھے۔ یہی تعلیم کے اجارہ دار!

جب اساتذہ کی انجمنیں شروع شروع میں بنیں تو ان کا مقصد اوّل محض اپنے آپ کا بچاؤ تھا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جب چند حقیر چڑیاں سر جوڑ کر بیٹھ جاتی ہیں اور ملکر شاہین پر ہلّہ بول دیتی ہیں تو پرندوں کے اس ڈاکو شہنشاہ کو بھاگنے کے سوا اور کوئی راہ نہیں ملتی۔ اسی طرح اُستادوں نے اپنی انجمنیں بنائی اور ان سیاسی اور سماجی لٹیروں کو جو ان کی مملکت پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے دُور سے للکارا، انہیں تعلیمی معاملات میں بے جا مداخلت سے روکا جب ان کی مملکت خارجی اثرات سے پاک ہو گئی تو انھوں نے تعمیری کام شروع کر دیا۔

بھلا کوئی ان خدائی فوجداروں سے پوچھے کہ تعلیمی سرزمین میں یوں بے باکانہ در آتے ہوئے چلے آنا کیا معنیٰ رکھتا ہے۔ وہ تو اس وقت تک ہی ایسا کر سکتے تھے جب تک اس گھر کے منتظم خوابِ خرگوش میں تھے۔ اب یہ بیدار ہو گئے تو باہر کے لوگ سب کے سب فرار ہو گئے۔ اب دورِ تعلیمی سرحدوں کے پار کھڑے للچائی ہوئی نظریں ڈال رہے ہیں لیکن اندر جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اب اُستادوں کا دعویٰ یہ ہے کہ تعلیم کا نصاب اور

اس کے طریقے وہ خود متعین کریں گے۔ اپنے کام کی جانچ پڑتال خود کریں گے اگر انعام دینا ہوگا تو خود دیں گے اگر سزا تجویز کرنا ہوگی تو خود کریں گے۔ ان کی مملکت میں کسی دخل در معقولات کرنے والے کے لئے جگہ نہیں۔ خواہ وہ دخل در معقولات دینے والا کوئی انسپکٹر ہی کیوں نہ ہو۔

ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے ہاں بھی اساتذہ میں اسی طریق سے آپس میں مل جل کر کام کرنے کا سلیقہ پیدا ہو جائے گا۔ وہ آپس میں تعاون کرینگے۔ آپس میں ایک دوسرے کی عزت کریں گے اور اس طرح سب کی بھلائی میں ہر ایک کی بھلائی ہوگی۔ سب کی عزت میں ہر ایک کا ساجھا ہوگا!

لیکن اس مقدس اور بابرکت اُمید کے محل کو کھڑا کرتے ہوئے ہمیں اس کی ان غیر مقدس بنیادوں کی طرف بھی اک نگاہ کر لینا ضروری ہے جن کی وجہ سے یہ ایوان ہمارے دیس میں اب تک نہ بن پایا۔ ہم اساتذہ جو ایک دنیا کو تعاون اور ہم آہنگی کا سبق دیتے ہیں۔ جب خود اس میدان میں اُترتے ہیں تو کیسے بے آہنگ ہو جاتے ہیں!

اگر ہم اس مسئلہ کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو شاید اسے اُصول تلافی (principle of compensation) کے ذریعہ سمجھا سکیں جس کو ہم سادی زبان میں "نفسیاتی قلابازی" کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ سیاسی قلابازیاں تو آپ نے بہت سی دیکھی ہوں گی لیکن سب سے دلچسپ وہ

قلابازی ہے جو ایک نہیں سیکڑوں کھا رہے ہیں ہمسر بازار کھا رہے ہیں اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ کھا بھی رہے ہیں یا نہیں حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ایک فرد اپنے مخصوص پیشہ کے حلقے میں کہتا ہے۔ اس پر عمل وہاں نہیں بلکہ باہر کرتا ہے اور جو کچھ باہر کہتا ہے اس پر اپنے مخصوص پیشہ کے حلقے میں عمل کرتا ہے۔ اگر کوئی قصاب انجمن انسداد بے رحمی حیوانات کا صدر ہو جائے تو یہ کچھ ایسا اچنبھا نہیں۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز تو اس ہیڈ ماسٹر کا رویہ ہے۔ جو سال بسال بچوں کو تعاون اور محبت کو درس دیتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ مستقل طور پر اصولاً پورے چودہ سال اپنے سینئر اسسٹنٹ سے زبانی کبھی بات نہ کی جب بھی کچھ کہنا ہوا تو لکھ کر دیا معلوم نہیں یہ صاحب جب گھر پر بیوی تو کھانے کے لئے کہتے ہوں گے (بلکہ کہتے تو کیا "آرڈر" ہی دیتے ہوں گے) تو شاید تحریراً دیتے ہوں اور جب تک چپراسی کی کتاب پر دستخط نہ لے لیتے ہوں چین نہیں آتا ہو گا۔

ہمیں پیشہ ورانہ زندگی میں ضرورت ہے کہ زندگی کے ان بندھنوں کو جو ہمیں اصطبل کے کٹ کھنے بچھیروں کی طرح لکڑی کے علحدہ علحدہ خانوں میں بند رکھتے ہیں۔ اُٹھا دیں تاکہ ہم جب آپس میں ملیں تو سر جوڑ کر ملیں نہ کہ دولتیاں جھاڑتے ہوئے یا ٹکراتے ہوئے۔

ایک ناول نویس نے ایک مدرسہ کی مہا بھارت۔ اس کے

اسٹاف کی۔ رزمیہ داستان لکھی ہے۔ اس میں ایک باب کا عنوان چھتریوں کی جنگ ہے۔ اس جنگ کا الٹی میٹم یہ ہے کہ ایک اُستاد مدرسے میں اپنی چھتری ہمیشہ ایک خاص کھونٹی پر ٹانگ دیتے تھے۔ اس مدرسے میں ایک نیا استاد آیا۔ اس نے پہلے دن اتفاقیہ طور پر اپنا چھاتا ان سے کچھ پہلے اسی کھونٹی پر ٹانگ دیا اس کے بعد وہ جنگ شروع ہوئی جو اس مدرسے کی تاریخ میں چھتریوں کی جنگ کے نام سے مشہور ہے۔

اس استاد نے وہاں چھتری کیا ٹانگ دی یوں کہو کہ دوسرے کی قسمت کا ریزرو لیبل نوچ کر پھینک دیا اور اپنا اس کی جگہ لگا لیا۔ اب کیا تھا دونوں میں غضب کی دوڑ شروع ہوئی اگر کھیل کا میدان ہے تو ایک صاحب ریفری بننے کے لئے دوسرے سے پہلے پہنچنے کی کوشش کرینگے۔ اگر انسپکٹر صاحب کے استقبال کے لئے اُستادوں کو صف میں کھڑا کیا جا رہا ہے۔ تو دوسرے صاحب پہلے سے سبقت کے جانے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ انسپکٹر صاحب کا مقدس پنجہ ان کی انگلیوں کو پہلے چھوئے اور جب پہلے ہاتھ ملا لیا تو دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہے ہیں۔ کہو میاں چھاتا پہلے لٹکا دیا یا نہیں؟۔

مشکل یہ تھی کہ ہر موقعہ پر کھونٹی ہمیشہ ایک ہی رہی اور چھاتے دو۔ اسے قسمت کا ہیر پھیر کہیں یا ہیڈ ماسٹر کی سیاست کہ کھونٹی ہمیشہ ایک ہی رہی

آخر کار ایک دن وہ آیا جب دونوں کو ایسے کھونٹے سے سابقہ پڑا جہاں ہر بھلا مانس ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ یہ تھا شادی کا کھونٹا۔ اسکول میں ایک نئی اُستانی آئی اور دونوں اپنے اپنے چھاتے لئے اس کی طرف دوڑے۔

میں اس قصّے کو زیادہ تفصیل سے آپ کے سامنے نہیں سُنانا چاہتا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ ہر مدرسے میں اکثر کھونٹی ایک ہی ہوتی ہے اور چھاتوں والے ایک سے زیادہ۔ کیا ہم آپس میں اتنی مروّت، اتنی رواداری بھی نہیں رکھ سکتے کہ ایسے موقعہ پر چھاتوں کو ایک دوسرے کے سروں پر چلائے اور گھمائے بغیر لٹکالیں!

ہم بچوں کو ہر روز باہمی محبت ورہمدردی کا سبق دیتے ہیں۔ ہم مدرسے کی حدود سے باہر لوگوں سے کیا محبت بھرا برتاؤ کرتے ہیں۔ لیکن مدرسے کی چار دیواری میں ہم یہ چولا بدل لیتے ہیں۔ ہم شدید احساس کے پتلے، جھوٹی خودداری وپندار کے بُت بن جاتے ہیں۔ اگر ہمیں کوئی ایک نظر دیکھ رہا ہے تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے جسم پر چاند ماری کر رہا ہے کوئی ہنستا ہے تو سمجھتے ہیں کہ زہر چھڑک رہا ہے۔ اگر ہم اپنے پیشہ کے وقار کو بڑھانا چاہتے ہیں تو ہمیں ایک مرتبہ اور نفساتی ہم آہنگی کا ثبوت دینا ہوگا اور ان تضاد کو جو مدرسے کے اندر اور باہر ہمارے برتاؤ میں موجود ہے دور کرنا ہوگا۔
اگر ہم کسی قلم میں اپنے آپ کو ایک دوسرے پر چھاتے سے وار کرتے اور

صفائی سے خالی ہاتھ دیتے دیکھیں تو ایک دفعہ ہمیں اپنے آپ پر ہنسی آجائیگی
اپنے آپ پر ہنسنے کی ہمت کرنا اور دوسروں کے ہنسنے میں شریک ہونا بھی ایک معمولی مدرسہ کو اچھا مدرسہ بنا سکتا ہے۔

زندگی کے مذاحیہ پہلو کی ہماری پیشہ ورانہ زندگی میں بڑی کمی ہے ہم لوگ فطری طور پر سنجیدہ واقع ہوئے ہیں۔ ہمارے چہرے فسلاً لانبے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہنسی اور قہقہے سے ان کی لمبائی کو کم کیا جائے۔ لیکن قہقہہ لگانے کا سامان کہاں سے لائیں؟ ایسے سوال کا ہمیں کسی اُستاد سے توڑ نہ تھا۔ ان کے پاس تو قہقہہ کا سامان ہی نہیں حشر سامانی ہے۔ ننھے منھے بچے زندگی کا نمک دان ہی نہیں قہقہہ دان ہیں۔ مزاق کا بڑا وصف یہ ہے کہ خود ہمیں دوسروں کو ہنسائیں۔ اور پھر ہنسی ہو زہر خند نہ ہو۔ چھیڑ ہو ڈنک بازی نہ ہو۔ مزاق میں دلکشی ہو۔ دل شکنی نہ ہو۔ یہ مزاج آپ اکثر بچوں کے معصوم سوالوں اور ان کے جوابات میں پائیں گے وہ مزاح سلیم جو معیاری مزاح نویسوں میں ہی مل سکتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ابتدائی مدرسے کے اُستادوں کو ایسے مضامین پڑھنے کی نہ فرصت نہ ضرورت۔ انہیں تو فطرت خود قہقہہ مار کے، گدگدا کے ہنسانے کی کوشش کر رہی ہے اگر وہ اس پر بھی نہ ہنسیں تو کل دنیا کو ان پر ہنسنا چاہیئے اس ظرافت کے چھینٹے اکثر انسپکٹر لوگوں پر بھی پڑ جاتے ہیں۔ بازی

بازی، بارشِ بابا ہم بازی۔ مگر بچوں کو روکنے والا کون ہے۔ بچے ان کی داڑھی سے کھیل لیتے ہیں۔ کبھی کبھی جھٹک لیتے ہیں کہیں مصنوعی طور پر تو نہیں لگائی ہوئی!

ایک مرتبہ ایک بھاری بھرکم انسپکٹر صاحب کسی چھوٹے درجے میں آپہنچے یہاں ایک استانی پڑھا رہی تھی، اسباق الاشیا کا زمانہ تھا مطالعۂ قدرت کمرے کی چار دیواری میں کیا جاتا تھا بچے چڑیوں اور مچھلیوں کی رنگا رنگ زندگی کا علم ان کے بے روح مٹی کے مجسموں اور بے رنگ تصویروں سے حاصل کیا کرتے تھے۔ انسپکٹر لوگوں کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ وہ تو ہمیشہ ہم رنگ زمین دام بچھاتے ہیں جس میں بچے کیا اچھے خاصے کہنہ مشق اُستاد بھی پھنس جائیں۔ انسپکٹر صاحب کو خیال ہوا کہ ان مجسموں سے بچے چڑیوں کے چونچ پر سب ہی کچھ جان لیتے ہیں مگر آواز کہاں سے لائیں گے؟ چلو یہی دریافت کرو کہنے لگے بچوں سب کے سب آنکھیں بند کرلو اور کان لگا کر سنو ہم منھ سے ایک پرندے کی آواز نکالیں گے تم سب یوچھنا کونسی چڑیا ہے۔ بچوں کے لئے اچھا خاصہ کھیل تھا فوراً تیار ہو گئے جب سب نے آنکھیں بند کرلیں تو انسپکٹر صاحب نے چٹاخ سے ایک آواز نکالی اور پوچھنے لگے بتاؤ کونسی چڑیا ہے۔ بچے کچھ تو معائنہ کی وجہ سے پریشان تھے اور کچھ انسپکٹر صاحب جیسی باوقار ہستی کے منھ سے ایک چڑیا کی آواز نکلنا تو کیا، اس کا تخیل بھی نہیں کر سکتے تھے

بار بار سوال کرنے پر پچھلے بنچوں سے ایک بچے نے شرماتے لجاتے ڈرتے ڈراتے ہاتھ اُٹھایا۔

ج۔ جناب چڑیا کی آواز ایسی کہاں ہوتی ہے۔ آپ نے شاید اُستانی جی کا منھ چوم لیا تھا!

خدا جانے اصل بات کیا تھی۔ یا تو انسپکٹر صاحب نے پرندے کی نقالی میں غلطی کی تھی اور یا ان کی اُستانی جی سے کہیں پہلے کی ملاقات تھی اور بچے انداز طلب کی داد دے رہے تھے۔ یا اُستانی جی کے ادائے حُسن کی داد۔ مگر اتنا ماننا ہوگا کہ بچوں میں صاف بیانی گستاخی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

اس مختصر طویل لطیفے سے میرا یہ مقصد ہے کہ بچوں کی دُنیا میں رونے رُلانے کی اتنی جگہ نہیں جتنی ہنسنے ہنسانے کی۔ اگر ہم ان گہرے تاریک پردوں کو جو ہمارے درجے کے کمرے پر ہر وقت پڑے رہتے ہیں اک دم اٹھادیں اور مزاح اور زندگی کے مسکراتے ہوئے سورج کو اندر آنے دیں تو یہ نور ہماری روح کو بھرپور کر دے گا اور ہم غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو مسرور اور زندگی سے مطمئن پائیں گے!

سماج اور اُستاد

تعمیر حیات! کہتے ہیں کہ اُستاد تعمیر حیات کرتا ہے۔ اینٹ پتھر کے
کے گھروندے لکڑی لوہے کے نمونے نہیں بلکہ اُس کا کام تعمیر حیات ہے
نئی نسل کی زندگیوں کی تعمیر و تربیت ہے۔ اینٹ پتھر کی عمارت اگر بیٹھ گئی تو،
ایک دو کونے کر بیٹھ جائے گی۔ اگر کسی نکمے اور سُست کاریگر نے ہوائی جہاز
میں ڈھیلا پُرزہ لگا دیا تو ممکن ہے ایک بہادر ہوا باز کی جان اکارت چلی جائے
لیکن اگر ایک دل برداشتہ اور افسردہ اُستاد نے منزل حیات میں کوئی اینٹ
ٹیڑھی بیڑھی لگا دی تو ڈر ہے کہ سماج کا پورا محل کھڑکھڑاتا ہوا نیچے نہ آ جائے۔
ولایت میں ہر ہوائی جہاز کے کارخانے میں ایک ہدایت جلی حروف سے
لکھی ہوئی ہے "خیال رکھنا تمہاری ایک غلطی سے ایک بہادر جانباز کی جان
خطرے میں پڑ جائے گی"۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسی ہی کوئی ہدایت ہمارے
مدرسوں میں بھی لگا دی جائے "خیال رکھنا تمہاری ایک غلطی سے پوری سماج
کی زندگی خطرے میں ہے"۔

اُستاد کی کامیابی اور ناکامی کوئی انفرادی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس

کی گونج وقت کے ایوانوں میں سے گذرتی جائے گی اُس کی صدا فضائے بسیط کی وسعتوں کو اپنے دامن میں لے لے گی، اس کی خامیوں کا اثر اپنی ذات سے بڑھ کر اُن دائروں کی طرح بڑھتا چلا جائے گا جو ایک پتھر پھینک دینے سے پانی میں پیدا ہو جاتے ہیں بڑے اور پھر اُس سے بڑے اور اس کے بعد سب سے بڑے۔

جب تعلیم کے عمل کی اہمیت مکان و زمان کی حدود بھی پار کر گئی تو دیکھنا یہ ہے کہ اُستاد یعنی سماج کا نمائندہ جسے اس بارگراں کا حامل بنایا گیا ہے اُٹھانے کے قابل ہے یا نہیں کہیں وہ قرآن کریم کا ظلوماً جہولاً تو نہیں، جس نے وہ بار بھی اُٹھا لیا جو پہاڑوں سے نہ اُٹھایا گیا۔ ہمارے ملک میں تو اُستاد کچھ ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ غریب ہے۔ کم استعداد ہے۔ کم ہمّت ہے۔ کم منصب ہے۔ سماج کی محفل میں اس کی جگہ جوتیوں سے ذرا آگے اور صدر سے کہیں پیچھے ہے۔ جہالت اور بے علمی کے کوہ پیکر عفریت کے سامنے ہم نے ایک بالشتیے کو کھڑا کر دیا ہے۔ ایک قوم کے دماغ کی جراحی کے لئے ہم نے روایتی جراح کو دعوت دے دی ہے۔ وہ جراح جس کے پاس جوہر دار آلات کی بجائے محض ایک زنگ خوردہ نشتر موجود ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے اس مایوسانہ جہاد کو دیکھ رہے ہیں جو اُستاد بے علمی اور کور ذہنی کے خلاف لڑ رہا ہے کیا اس جہاد کو جاری رکھنے، اس کو کامیاب کرنے کی ذمہ داری ایک

فردِ واحد پر، ایک ملائے مکتب پر ہی عاید ہوتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں! یہ بوجھ جو ہمارے سر آن پڑا ہے سب کے اُٹھائے ہی اُٹھے گا اور یہ کام جو ہم پر آن پڑا ہے سب کے بنائے ہی بنے گا۔ اس عظیم الشان مجاہدہ میں سب لوگ ہمت باندھ کر اور سر جوڑ کر نہ لگیں گے تو اس میں یقیناً اُستاد کی ہار ہوگی اور اُستاد کی ہار کے یہ معنی ہیں کہ کل سماج کی ہار ہوگی۔

پنجاب میں ایک کہاوت ہے کہ بچوں میں سب کا ساجھا ہوتا ہے اس کا مقصد کوئی افلاطون والی جائیدادی اشتراکیت نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہی ہے کہ بچوں کی تربیت و تہذیب کا فرض محض ماں اور باپ ہی نہیں بلکہ ایک گونہ پوری بالغ نسل پر عائد ہوتا ہے۔ اس لئے ہم سب کا بھلا اسی میں ہے کہ خوب اچھی طرح سے سمجھ لیں کہ سب کے بچوں میں سب ہی کا ساجھا ہے۔ اس سماجی اشتراکیت میں نہ تو کوئی غریب ہے نہ امیر، نہ کوئی اُونچا ہے نہ نیچا۔ اس میں ہمارا ہی بھلا نہیں بلکہ ہمارے بچوں کا بھی بھلا ہے۔ ایک امیر زمیندار اپنے بچے کو ہمالیہ کی وادیوں کے اُونچے یورپی مدرسوں میں تعلیم دے سکتا ہے، مگر کبھی نہ کبھی اسے بھی جلتے ہوئے، تپتے ہوئے میدانوں میں اُترنا ہوگا۔ اس مصیبت سے تو ہماری حکومتیں اور ان کے اعمال بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ ایک اُونچے درجے کا سرکاری ملازم اپنے بچے کو نجی طور پر تعلیم دلالے، مگر ہر سمجھدار باپ جانتا ہے کہ علحدہ طور پر نجی تعلیم کہاں تک بچے کی شخصیت کی

تعمیر اور تکمیل میں امداد دے سکتی ہے۔ اور کہاں تک اس قسم کی تعلیم اس کی سماجی جبلتوں کو ایک مفید شہری کی عادات میں بدل سکتی ہے۔ بچے کی نفسیاتی زندگی میں آپس میں مل بیٹھنے اور مشترکہ کام کرنے کا بڑا گہرا جذبہ ہوتا ہے اور نجی تعلیم سے قوتِ عمل کی یہ سوت خشک ہو جاتی ہے اور اس کی خشک بالو میں سے جو گرد و غبار اُٹھتا ہے وہ اس کی پوری نفسیاتی اُٹھان پر ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا بن کر چھا جاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ امارت اور حکومت تعلیمی لحاظ سے ایک صیّاد کے خطرناک جال ہیں۔ ہم جتنا بھی اُن سے بچ کر نکلنا چاہتے ہیں۔ ان کی گرفت ہم پر مضبوط ہوتی جاتی ہے۔

اگر ہمارے بڑے آدمی یہ سمجھیں کہ اپنے بچوں کو علحدہ کر کے وہ اہیں اچھی تعلیم دلا سکیں گے تو ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان بچوں کو اگرچہ اس وقت تو آپ نے ایک تعلیمی خلا میں ایک محفوظ اور مصئون شیش محل میں رکھ لیا لیکن جب ماحول کے زبردست جھکڑ اس خلا میں سائیں سائیں کرتے داخل ہوں گے تو یہ مصنوعی طور پر اُگائے ہوئے پودے زندگی کی رُوح بخش ہواؤں کے سامنے مرجھا کے رہ جائیں گے۔

ماحول کے اثر کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک کوئلے کی کان کا مالک سفید براق لباس میں مزدوروں کا کام دیکھنے اندر جاتا ہے اور واپسی پر سمجھتا

ہے کہ وہ جیسا صاف تھا ویسا ہی لوٹ آیا لیکن اسے یہ پتہ نہیں کہ شفاف اور چمکتے ہوئے ذرّوں کی ایک تہ اس کے پھیپھڑوں کے اندر ایسی بیٹھ گئی ہے کہ شاید اس کے دل پر بھی اثر کئے بغیر نہ چھوڑے گی۔ احول کا اثر نہ آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے نہ کانوں سے سُنا جاسکتا ہے لیکن قدرت کے کارکنوں کی طرح اس کا خموش اور بادپا اثر برابر اپنا گھر بناتا چلا جاتا ہے۔

ہماری تعلیمی اور ماحولی وبائیں ایسی مصیبتیں نہیں جن سے ہم سول لائنوں میں رہ کر بچ سکیں۔ یہ ماحول ایک پرچھائیں کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ ہے۔ ان کا علاج ان سے بھاگنے میں نہیں بلکہ مردانہ وار مقابلہ کرنے میں چھپا ہے اگر ہم ایک اچھا تعلیمی ماحول پیدا کرنا چاہتے تو ہمیں اس کام میں اُستاد کا ہاتھ بٹانا ہوگا۔ ہمارے بڑے آدمیوں کو تعلیمی مسائل میں ہمدردی اور سمجھداری کے ساتھ دلچسپی لینا ہوگی۔ ہمارے لئے نہیں اپنے لئے صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ اپنے بچوں کے لئے۔

ان لوگوں کے دل میں کبھی کبھی تو خیال آتا ہوگا کہ ہمارے اقدار میں کس قدر تبدیلی۔ ہمارے نظریوں میں کس قدر انقلاب کی ضرورت ہے ایک حاکم ضلع کو شاید سالوں کے ذاتی تجربے کے بعد پتہ لگ جائے کہ ہمارے بالغ شہری کی تعلیم شہریت میں کیا نقائص ہیں۔ ایک زمیندار کے دل پر شاید کبھی یہ چیز روشن ہو جائے کہ کھیتی اور آزاد کھیتی میں کس قدر تعلیمی نکنات ہیں۔ تو کیا آج

ہے کہ وہ اُستاد کے لئے اپنے من کے مندر کے مقفل دروں کو کھول دیں۔ اپنے منصب اور اسکی پابندیوں سے بلند ہو کر ایک انسان کی حقیقت سے دوسرے انسان سے گفتگو کریں۔ اس کے سینہ پر ایک محبت آمیز ٹھوکا دے کر کہیں دیکھو ابھی ہم نے بہت کم کیا ہے ہمیں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ترقی کی اس کٹھن اور دشوار گزار منزل میں ہمت نہ ہارنا۔ ہماری دُعائیں اور ہماری نیک خواہشیں تمہارے ساتھ ساتھ ہیں۔ دوسرے ممالک ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہیں۔ ایک امریکی سیاح جب چیکوسلوویکیا کے ایک مدرسہ میں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ ملک کا ایک مشہور و معروف مصنف ایرنسٹ ڈرالنویس بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ زیادہ جستجو سے پتہ چلا کہ مصنف موصوف جو اپنے وقت کے ہر لمحہ کا کھنکتے ہوئے نقرئی اور طلائی سکوں میں تبادلہ کر سکتا ہے اکثر اوقات وہ اس مدرسہ میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ چیز اس کے ماہانہ لائحہ عمل کا ضروری حصہ ہے۔ ایک سیدھے سادے خلوص والے دل کے ساتھ وہ بچوں کی محبت بھری سبھا میں شامل ہو جاتا ہے۔ ان کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا۔ اُن کے ساتھ رہتا سہتا ہے۔ اکثر جنگل کی سیروں میں وہ انہیں قدرت کے اس ابدی حسن سے متاثر کراتا ہے جس نے اس کی تصنیفات کو سہانی روشنی سے جگمگا رکھا ہے۔ کبھی وہ بچوں کے ساتھ مطالعہ قدرت کرتا ہے۔ دیکھنے اور پرکھنے کی قوتوں کو بیدار کرتا ہے۔ علت و معلول کے عینی مشاہدہ

کے ذریعہ اُن کی قوتِ استدلال کو روشن کرتا ہے۔

کیا ہمارے ملک میں بھی کبھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے؟ کیوں نہیں؟ اس صحرا میں بھی کہیں برگِ نخیل کی سبزی جھلک جاتی ہے۔ اکثر شانتی نکیتن کے آموں کے کنج میں ننھے ننھے بچے گرودیو، رابندرناتھ کے گرد حلقہ باندھ کر ناچتے ہیں۔ اکثر گو کھلے جیسا اُستاد بچوں کے ساتھ اس بنجر اور پتھریلی چٹان کے سایہ میں کھیلتا ہے جس پر ایک صبح اُس نے آفتاب کی کھلتی ہوئی کرنوں کے درمیان اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ غربت اور خدمت خلق کی قسم کھائی تھی۔

جب ایک سیاسی کانفرنس کی ہماہمی اور گھما گھمی میں ملک کا سب سے مقتدر لیڈر تعلیمی نمائش کے معائنہ کو جاتا ہے۔ تو اس کی ملاقات ایک بچے سے کرائی جاتی ہے جس کے ہم جماعت سینکڑوں میل دور کمرے میں بیٹھے اپنے عزیز دوست کا جغرافیائی نقشے پر تعاقب کر رہے ہیں۔ اُن کھیتوں کی پیداوار کا مطالعہ کر رہے ہیں جن کے سایہ میں اس کا خیمہ تنا ہے۔ اس کی روزانہ مصروفیات پر دلچسپ مضامین لکھ رہے ہیں۔ پورے نصاب کا کام ایک جھٹکے میں پرانے فرسودہ ڈگر سے ہٹ کر ایک اُونچے تعلیمی معیار پہ پہنچ گیا۔ سیاست داں کا چہرہ بچے کو دیکھ کر کھل جاتا ہے۔ مبارک ہے وہ بچہ جس نے استنے بچوں کی زندگی میں ایک نئی دلچسپی پیدا کر دی۔ اس بچے کے اُستاد کا دل

اس واقعہ سے باغ بلغ ہو گیا۔ اس واقعہ سے اُس کی تنخواہ میں کوئی اضافہ نہ ہوا تھا مگر جب وہ مجھے یہ باتیں سُنا رہا تھا تو میں نے اس کے چہرے پر ایک تازگی، ایک بشاشت پائی جو ہماری آئندہ نسلوں کے لئے ایک نئی زندگی کا پیغام ہے۔

ایسا ہی پیام دُنیا کی زندہ قوموں کو اُن کے بڑے آدمیوں نے اکثر دیا ہے سقراط اور افلاطون۔ یونان کے درخشاں زمانے کے تابناک ستارے اپنا درس ایتھنز کے بازاروں۔ اس کی سیر گاہوں میں دیتے تھے سقراط ایک غریب ملازم کو روزمرہ کی باتوں ہی سے فیثاغورث کا اُصول سمجھاتے ہوئے نہیں شرماتا۔ اور افلاطون جیسا مفکّر نیکی کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے اس بات سے نہیں گھبراتا کہ اہل ایتھنز اُس کے سامنے سے ایک ایک کر کے اُٹھتے جا رہے ہیں اور ارسطو کے سوا کوئی اس طوفانِ علم کی تاب نہیں لا سکتا لیکن ہمارے بڑے آدمی مدرسوں میں جا کے کیا کرتے ہیں۔ اکثر اُن کی آمد ایک جلوسانہ انداز میں ہوتی ہے کبھی کبھی کوئی بڑا آدمی مدرسے میں انعامات کے جلسے کی صدارت کرتا ہے کبھی کوئی بڑی ہستی معائنہ کرنے آ جاتی ہے۔ کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے بچوں کو کسی بڑی ہستی کے استقبال یا خوش آمدید کے لئے رنگ برنگ کی جھنڈیاں دے کر خوبصورت قسم کی پگڑیاں پہنا کے یوں دو رویہ کھڑا کر دیا جاتا ہے جیسے

مغلوں کے زمانے کے باغ میں روشوں پر سرو کے درخت کھڑے ہوتے ہیں
بڑے آدمی کی سواری آئی فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ ننھے ننھے
ہونٹوں نے کبھی ڈرتے ڈرتے کبھی جھجکتے جھجکتے کبھی کبھی ڈر کی وجہ سے دفعتاً
اُونچی آوازیں ہپ ہپ ہرّے کی صدائیں بلند کیں۔ بڑے آدمی کی
سواری جس تیزی سے آئی اُسی تیزی سے آگے نکل گئی۔ بچوں نے دبی
ہوئی آوازیں ڈرتے ڈرتے انگلیوں سے اشارا کیا۔ صاحب ادہر بیٹھے
ہیں، مگر اتنے میں اُستاد جو آوارہ بھیڑیں دوبارہ اکٹھا کر کے واپس مدرسے
کو ہانکنے کو تیار رہے غصہ میں گھڑک کر بولا "تمہاری شامت تو نہیں آرہی۔
یہ ٹھکتی ہوئی انگلیاں ڈنڈے سے چٹخائی جائیں گی تم ایک بڑے آدمی پر اشارہ
کرنے کی جرأت کرتے ہو؟"

معصوم بچے سہم کر رہ جاتے ہیں۔ اُستاد ان کی نگاہ میں ایک بہت
بڑی ہستی ہے اور جس ہستی سے اتنی بڑی ہستی بھی اتنی خائف ہے وہ کتنی بڑی
ہو گی۔ اُن کی ننھی سی قوت متخیلہ شاید اُس کی پہنائیوں کو اپنے دامن میں
بھی نہیں لے سکتی۔ اب ایک نیا سین آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ مدرسے
کے کھیل کے میدان میں ایک مخملیں شامیانے کے نیچے ایک مانگے ہوئے قالین
کے اُوپر ڈائس ایک بڑی چوکی اور اُس کے اُوپر صدارتی کرسی اور صدارتی
کرسی کے اُوپر ایک بڑا آدمی ایک طرف سے ایک بڈھا سا اُستاد جس کی

عینک اُس کی ناک کی پھنگی پہ ٹکی ہوئی ہے۔ پیچھے کی قطاروں سے سمٹتا سمٹاتا، جھکتا جھکاتا، بچتا بچاتا۔ فرطِ ادب سے ایک سو بیس درجہ کا زاویہ بناتا چوکی کے ایک کونے پر ہی رک جاتا ہے اور کہتا ہے "معزز حضرات آج اس ادارے کے لئے کس قدر فخر و مباہات کا دن ہے کہ جناب صدر نے ہمیں اپنے قدوم میمنت لزوم سے افتخار بخشا ہے۔ میرے عزیزو تمہیں پتا ہونا چاہیئے کہ ہمارے صدر محترم آج ہمارے صوبے کی سیاست کے سب سے درخشندہ ستارے ہیں۔ عزیز طالب علمو سیاست داں بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ بہت بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ بہت بڑے آدمی اُن کے دل ایک روحانی جذبے سے منور ہوتے ہیں اور اللہ کا اُن کے سروں پر سایہ ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس کے بعد تھوڑی سی ہلچل، تالیوں کے زبردست مظاہرے کے درمیان جناب صدر اپنی بھاری بھرکم شخصیت کو دونوں ہاتھوں سے لئے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تقریر کے وقت صدر محترم اپنے ہاتھ کے دونوں انگوٹھوں کو واسکٹ کی جیبوں میں پھنسائے رکھتے ہیں اور اُن کے دونوں ہاتھ اب اُن کے توند پر یوں جمے ہوئے ہیں جیسے کہ پہلے میز پر تھے۔ یہ توند اُن کی دُنیاوی کامیابی کا جیتا جاگتا لڑھکتا ثبوت ہے۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے وہ بانگ دُہل اعلان کر دینا

چاہتے ہیں کہ دوستو زندگی کی کامیابی اسی میں مضمر ہے۔ اب ان کی تقریر شروع ہوتی ہے "معزز خواتین اساتذۂ کرام اور طالب علمو۔ میرے لئے یہ نہایت مسرت کا دن ہے کہ میں آپ لوگوں کو آج آپ کی اسکولی زندگی کی آخری تقریب میں شامل ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ میرے عزیز و تم زندگی میں پہلا قدم رکھ رہے ہو۔ دیکھنا اگر ایک قدم آگے بڑھاؤ تو دوسرا قدم پیچھے نہ ہٹنے پائے۔ سیٹھ مکند لال کی طرف دیکھو جنہوں نے اپنی ہمت اور کوشش سے ایک کارخانے سے شروع کر کے اب دس کارخانے کھول لئے ہیں راجہ حسن یار خاں بغتانہ کی جائداد ان کی انتھک اور قابلِ مبارک باد کوششوں سے ہمارے دیکھتے دیکھتے چوگنی ہو گئی ہے۔ میرے عزیزو یہ درخشندہ مثالیں تمہارے سامنے ہیں۔ ان پر چلو قسمت کامیابی کا سہرا تمہارے سر پر رکھے گی۔ . . . . "

ماسٹر علی محمد صاحب تقریر سن رہے ہیں اور ان کا دل بے طرح اُمڈا آرہا ہے۔ اُن کا پچھلے سال کا سب سے اچھا طالب علم کچہری میں مہینوں سے جوتیاں چٹخارہا ہے۔ ایک دفتری کی جگہ کا اُمیدوار تھا مگر مل نہیں سکی۔ دوسرا لوگوں کے طعنوں سے بچنے کے لئے گھر سے باہر نکل گیا ہے۔ اُن کے کانوں میں کامیابی کے یہ سنہرے خواب کچھ بھلے معلوم نہیں ہوتے مگر بچے؟ بچوں کی نگاہ میں سیٹھ مکند لال اور راجہ حسن یار خاں جو سامنے

بیٹھے ہوئے اچھے خاصے بھلے آدمی نظر آتے تھے۔ اب دیوتا معلوم ہوتے ہیں۔ تقریر ختم ہوئی بڑے آدمی نے جلدی جلدی دو چار معززین شہر سے ہاتھ ملائے۔ ایک دو اُستادوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ گویا ملانے کو ہیں۔ لیکن جلدی کے مارے صرف اُن کی اُنگلیوں کی پوریں چھو سکے اور ہاتھ دفعتاً یوں پیچھے کھینچ لیا۔ جیسے کہیں بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو۔ بچوں نے اس بات کو دیکھ لیا ہے۔ بچوں کی نگاہ بڑی تیز ہوتی ہے۔ اُن کا عزّتِ نفس کا احساس بہت بلند ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ اس سماج میں اُستاد کی کیا عزّت ہے۔ بچوں کے حافظے بعض باتوں کے لئے بہت ہی قوی ہوتے ہیں۔ وہ اس واقعے کو سالہا سال نہیں بھولیں گے۔

اور جب یہ بڑا آدمی واپس پہنچتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک بیزاری کا انداز اس کی باتوں سے جھنجھلاہٹ معلوم دیتی ہے۔ کسی گھر والے نے ڈرتے ڈرتے پوچھا بھی کہ "آج کہاں تشریف لے گئے تھے تو کچھ ترش رو سے ہو کر کچھ پیشانی چڑھا کے کچھ استغنا کے انداز میں بولے" اجی تھی ایک تقریر اسکول میں۔ میں تو تنگ آ گیا بچے، اُستاد، ہنگامہ، شور، میرے سر میں تو ہلکا ہلکا سا درد شروع ہو گیا ہے"۔ بہر حال سوال یہ ہے کہ اس قسم کی جلسوں تقریبوں سے کس کو کیا فائدہ پہنچا۔ کیا بڑے آدمی کی تقریر سے بچوں میں

بڑے جذبات پیدا ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ کیا کوئی ایسا موقع بھی ہوتا ہے
جہاں بڑے آدمی اپنے آپ کو انسانی خلوص سے پیش کر سکیں۔ کیا کبھی اُن
میں ایک حسین سادگی کی جھلک پیدا ہو سکتی ہے۔ سادگی، اخلاص، نیکی،
وہ نیکی جو اپنے مخصوص انداز میں دوسروں کو بھی نیک بنا دے۔ وہ سادگی
جو اپنے اثر سے دوسروں کو بھی سادہ بنا دے۔ مدرسے کی دُنیا سادگی کی
دُنیا ہے۔ اخلاص کی دُنیا ہے۔ معصوم روحوں کی دُنیا ہے۔ ایک حد تک
سچی اقدار کی دُنیا ہے۔ کیا اُن سے کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے جلوسانہ انداز
کو۔ اپنے دبدبے اور طمطراق کو اپنے نمائشی اور جھوٹے لباس کو۔ اپنے
آرائشی اور بھڑکیلے ملبوسات کو ایک لمحہ ایک پل کے لئے علحدہ اُتار کر رکھ
دیں اور اس بچوں کی دُنیا میں ایک بچے کی سادگی کے ساتھ آئیں۔ اپنے
اوج کے اخلاق عالیہ کی چمک اور ضیا سے اگر اس میں کچھ چمک ہے مدرسے
کے ماحول کو جگمگا دیں۔ ایک سچے اُستاد کو تصنّع اور نمائش سے دلی نفرت
ہوتی ہے خواہ یہ نمائش ایک لیڈر کی نمائش ہو یا ایک ایکٹر کی۔ اس کی
اُنگلیاں اس بھاری بھرکم اور فضول بھیس کو اُتار پھینکنے کے لئے تیار ہو جانا
چاہئیں۔ اور اُس کی تہ میں اُس کے سامنے ایک مخلص چہرہ اور ایک انسان
کی زندہ روح عریاں ہو جانا چاہیئے۔

جس عظیم الشان مشغلے میں وہ مصروف ہے وہ زندگیوں کی تعمیر

ہے۔ اس تعمیر میں کہیں بھی کسی کچی اینٹ جھوٹے مسالہ۔ یا نمائشی رنگ کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ استاد، بڑے آدمی، چھوٹے آدمی، غریب اور امیر ایک بہت بڑے کام میں مصروف ہیں۔ شعوری طور پر سماج کی بھاری بھرکم اور وزنی گاڑی کو آگے ڈھیلنے کے لئے ہر ایک کو ہر دانہ وار اپنا سینہ تان کر زور لگانا چاہیئے۔ ایک مخلصانہ کوشش۔ ایک سچا جہاد۔ جس میں ہر انسان دوسرے سے اخلاص اور باہمی مفاہمت کے سطح پر آکر اشتراک عمل کر سکے۔

زندہ قوموں پر ایسے دور گزر چکے ہیں جب کہ وہ زندگی کی ایک نئی تعلیم سماج کی ایک نئی تشکیل کے لئے جوشاں اور کوشاں تھے۔ اسی جوش اور ولولے کی رَو میں بہہ کر ٹالسٹائی نے دیہاتی بچوں کے لئے اپنا مدرسہ کھولا تھا۔ ایک بہت بڑی جاگیر کا مالک۔ ایک معزز خاندان کا درخشندہ ستارہ دن کو بچوں کے ساتھ جماعت کے کمرے میں مغز مارتا ہے سہ پہر کو ان کے ہمراہ علمی سیروں میں حصہ لیتا ہے اور رات کو ستاروں کی سہانی چھاؤں میں جنگل کے گھنے درختوں کے سایہ میں کبھی تو اُن کے دلوں میں قدرت کے لئے احساس حسن بیدار کرتا ہے اور کبھی کبھی ان معصوم کمسن بچوں کی امداد سے ادب وفن کی ابتدائی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔

روس میں وہ زمانہ کچھ عجیب بیداری کا زمانہ تھا۔ آزادی اور انتہائی ہمدردی

میں سر شار ادیب اور مفکرین چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح وہ ملک میں سچی اقدار کے معیار پھیلا دیں ٹالسٹائی ہی نہیں، چیخوف، ترگنیف، وٹر کی سبھی تعلیم کی سماجی اہمیت کو سمجھ رہے تھے۔ ایک دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ ایک آئندہ روشن مستقبل کی طرف نظریں جمائے بیٹھے تھے جس پر سے ظلمت کا پردہ ایک صحیح قسم کی تعلیم ہی اُٹھا سکتی ہے۔ وہ یہ بھی خوب جانتے تھے کہ کسی نسل کی تعمیر کا کام خاموش محنت اور دیانتدار مشقت چاہتا ہے یہ کام اسٹیج کے تختوں پر دھما دھم مچانے سے یا ایک ہتھ میں جھاگ بھر لانے، ایکٹر کی شاعری اور تقریروں سے نہیں ہو سکتا۔ میں حیران ہوں کہ اگر چیخوف کو ہمارے مدرسے میں اسی رسمی تعارف سے کرسیٔ صدارت پیش کی جاتی تو وہ کیا کہتا۔ اس کی مخلص اور نیک روح اس قسم کی ظاہر داری اور اور نمائشی تنظیم و شہرت سے کتنی گھبراتی تھی وہ اپنے اعزاز میں جلسوں اور دعوتوں کی تقریریں سُن کر یوں گھبرا اُٹھتا جیسے کسی نے اچانک اُس کی پیٹھ پر قمیص کے اندر یخ جیسا ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو۔

ایک دعوت کے متعلق لکھتا ہے "میں ایک دوست کے ہاں جاتا ہوں۔ شام کے کھانے کا انتظام ہے۔ بہت سے مہمان مدعو ہیں۔ بڑا لطف ہے خود بھی پی رہا ہوں دوسروں کو بھی پلا رہا ہوں۔ لڑکیوں سے بڑے لطف کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اتنے میں ایک صاحب کچھ بے طرح اہمیت کے

انداز میں کھڑے ہو جاتے ہیں گویا سرکاری وکیل ہیں۔ اور میری تعریف میں ایک تقریر جھاڑ دیتے ہیں۔" الفاظ کا جادو گر۔۔۔۔۔۔ بلند تخیل۔۔۔۔۔۔ آج ہمارے مابین۔ تم ہر جگہ عقلمندی پھیلا رہے ہو۔۔۔۔۔۔ انمٹ شہرت۔۔۔۔۔۔ ابدی مقبولیت۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا مجھ پر سے کوئی ڈھکنا اُٹھا لیا گیا ہے اور کوئی شخص میری کنپٹی پر پستول کی نالی جمائے کھڑا ہے۔ تقریر کے بعد گفتگو کی ہلکی سی سراہٹ اور پھر ایک بھونڈی اور تکلیف دینے والی خاموشی یہ سب لطف خاک میں مل گیا۔ میرا ہمسایہ اشارہ کرتا ہے تم بھی کچھ کہو جی چاہتا ہے کہ اُس کے سر پر بوتل اُٹھا کر دے ماروں۔"

اس کے برعکس جب وہ اپنے دیہاتی مکان میں بیٹھا ہوتا ہے اور کوئی گاؤں کا اُستاد کچھ گھبرایا سا۔ کچھ شرمایا سا۔ اُس سے ملنے آتا ہے۔ تو اُس کے اخلاص۔ اُس کی محبت۔ اُس کی سادگی سے ایک چنگاری اُڑتی ہے اور اُستاد کے ظاہری اخلاقی خس و خاشاک کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ وہ بھی ایک مقناطیس ایک پارس کے قریب پہنچ کر دمکتا ہوا کندن بن جاتا ہے۔

جب کبھی وہ صحت کی خاطر دیہی علاقوں میں نکل جاتا تھا تو وہاں کے مدرسے دیکھتا تھا۔ اُستادوں سے باتیں کرتا۔ ان کی مصیبت میں ہمدردی اُن کی مشکلات میں ہمدردی کا ہاتھ بڑھاتا تھا۔

گورکی نے اسے اکثر کہتے ہوئے سُنا۔" بھئی گورکی تمہیں پتہ ہے۔

ایک اُستاد ابھی ابھی یہاں آیا ہے۔ وہ بیمار ہے اور شادی شدہ بھی ہے۔ تم اس کے لئے کچھ کرسکتے ہو یا نہیں۔ فی الحال تو میں نے اس کے لئے انتظام کر دیا ہے۔"

دیکھنا گورکی ایک اُستاد تم سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ بیمار ہے اس لئے بستر سے تو اُٹھ نہیں سکتا ذرا تم ہی جا کر اس سے مل آؤ۔"

پیچخوف اکثر ان اساتذہ کی بے مقصد کپ شپ اور بے ربط گفتگو بڑی توجہ سے سنتا تھا۔ شروع شروع میں چند ایک منٹ کے لئے یہ اُستاد اپنے احساس کمتری کی وجہ سے عجیب دلچسپ حرکات کرنے لگتے تھے۔ ایک کرسی کے کنارے پر ٹکے ہوئے بیٹھ جاتے تھے۔ ایسی احتیاط اور نزاکت سے گویا اس کی سیٹ میں پنیں لگی ہوئی ہیں۔ اپنے بے ڈھنگے طریقہ پر خود ہی غیر مسائے چہرہ شرم کے مارے سرخ ہوا جا رہا ہے۔ ماتھے پر پسینہ چھوٹا پڑتا ہے۔ بڑی کوشش سے الفاظ چن رہے ہیں۔ جھنجھلا کر ڈھونڈ رہے ہیں تاکہ اس بڑے مصنف کے سامنے نکو نہ بن جائیں اور سلیس اور عالمانہ گفتگو کر سکیں۔ اُن کے شرمیلے پن کا مظاہرہ کئی ایک طریقوں سے ہوتا تھا یا تو گفتگو کا دھارا دفعتاً کچھ بند سا ہو جاتا تھا اور اس میں سے کہیں کہیں کچھ بوندیں رستی رہتی تھیں یا کبھی کبھی ان کے قید و بند ایک سیلاب کی آندھی میں ٹوٹ جاتے تھے اور وہ چیخوف پر بے ربط سوالوں کی ایسی بوچھار کر دیتے تھے جو اُن کے ذہن میں نہ اب تک کبھی آئے تھے اور نہ کبھی آئیں گے۔ ہمارے ملک میں بھی اکثر بڑے آدمیوں کو چھوٹے

اور غریب اُستادوں سے ملنے کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ اُن کے بھی منہ سے اکثر بات
نہیں نکلتی۔ اور جب نکلنی شروع ہوتی ہے تو بند نہیں ہوتی۔ یہ بڑے آدمی اپنی منصب
کی بلندیوں سے اُن کے اوپر مسکراتے ہیں اور اپنی عظمت کے احساس اور دوسرے
کی کم مایگی کے تخیل سے یوں پسیجے جاتے ہیں۔ جیسے سورج دیوتا کا چہرہ ہنستی
کے گول گپے کی طرح سے پھیل جاتا ہے۔ وہ شان استغنا سے چھوٹے آدمی کو
تھپتھپا دیتے ہیں۔ کچھ ان کے احساس برتری کو مہمیز لگتی ہے۔ کچھ دوسرے
کے احساس کمتری پر اوپری مرہم کا پھایا لگ جاتا ہے لیکن گفتگو اور ملاقات
کی سطح بہت مختلف ہے ایک چوکی پر نہیں بلکہ شملہ کی پہاڑیوں سے بھی اونچی
چوٹیوں پر ٹکا ہوا ہے۔ اور دوسرا زمین پر ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ نیچے۔

پیجوف جب ان چھوٹے اُستادوں سے بات کرتا تھا تو وہ اُن کی آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کر اُن کی زندگیوں کی مایوسیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ان
کے ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا کو جسے صرف ہمدرد دل رکھنے والے ہی
محسوس کر سکتے ہیں سننے کی کوشش کرتا تھا۔ جب کبھی وہ ان کی بے ربط گفتگو
اور ان کے عجیب و غریب اضطراری حرکات دیکھتا تھا تو اس کی غمگین آنکھوں
میں ایک مسکراہٹ چمکتی تھی۔ اس کے ماتھے پر ایک ہلکی سی شکن پڑ جاتی تھی اور پھر
وہ اپنی ملائم اور حسین آواز میں سادہ صاف اور گھریلو الفاظ بولنے لگتا تھا۔ یہ
سوال اس کے بیان کے لئے کچھ اجنبی سا ہوتے تھے۔ اس کو دفعتاً غیر شعوری

طور پر سادہ بنا دیتے تھے کھیل کا ڈھنگ ہی بدل جاتا تھا اسی اُستاد میں جو اپنے آپ کو بڑا استاطر اور عالم ظاہر کرنے کی چال چل رہا تھا ایک تبدیلی سی آجاتی تھی ایسی ہی ملاقات کے متعلق گورکی لکھتا ہے" مجھے ایک اُستاد کے متعلق یاد ہے۔ ایک اُونچا پیلا دُبلا سا آدمی۔ پیلا رنگ اور بھوک کے مارے چہرے کے زاویے نمایاں، لمبی طوطے جیسی ناک چیخوف کے سامنے بیٹھا ہوا اپنی سیاہ آنکھیں اُس کے چہرے پر جمائے ہوئے غمگین اور مدہم سروں میں برابر بولے جا رہا تھا" تعلیمی سال کے دوران میں زندگی کے ایسے تاثرات کی وجہ سے ایک نفسیاتی قران السعدین ہو جاتا ہے جو ہماری گرد و پیش کی کائنات کا ایک مادی مطالعہ بالکل مفقود کر دیتا ہے کائنات کیا ہے محض اضافی چیز ہے ۔ ۔ ۔ ۔ فلسفہ خودی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تصوف"۔

وہ فلسفے اور تصوف پر سینگ جمائے ہوئے گویا پلا پڑ رہا تھا اور کبھی وہ مختلف علوم کی سطح پر یوں ڈگمگا رہا تھا جیسے کوئی شرابی برف پر اسکیٹ کر رہا ہے" اتنے میں چیخوف نے بہت اطمینان اور نرمی سے پوچھا۔" اچھا یہ تو بتاؤ کہ تمہارے علاقے میں کونسا اُستاد بچوں کو پیٹتا ہے"؟

یہ سنتے ہی اُستاد اپنی کرسی پر سے اچھل پڑا اور مارے غصے کے دونوں ہاتھوں کو ہلانے لگا" جناب کیسے کہہ رہے ہیں؟ میں؟ نہیں! ہر گز نہیں! "چیخوف دوبارہ مسکرایا۔ اس حرکت سے اُستاد کو اطمینان سا ہو گیا۔ اور اسے

بھئی تم گھبرا کیوں رہے ہو۔ میں تمہیں نہیں کہہ رہا ہوں مجھے تو ویسے ہی یاد آ گیا تھا۔ خدا جانے کیسے معلوم ہوا۔ ہاں ہاں خوب یاد آیا۔ ایک دفعہ اخباروں میں پڑھا تھا کہ آپ کے علاقہ میں کوئی اُستاد بچوں کو پیٹا کرتا ہے" ۔ اُستاد اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے چہرے سے پسینہ پونچھا اور ایک آرام کا سانس لیکر گہری اور مدہم آواز میں کہنے لگا۔ "ہاں ہاں سچ ہے ایسی کچھ بات ہوئی تو تھی۔ اُس اُستاد کا نام منکاروف ہے۔ آپ تو خوب جانتے ہیں کہ یہ چیز ایسی کچھ تعجب انگیز تو نہیں ہے۔ زیادتی تو اس نے ضرور کی مگر وجوہات بھی تھیں۔ ایک تو اس کی شادی ہو گئی ہے۔ اور اُس پر چار بچے رستم یہ ہے کہ بیوی بیمار اور خود تپ دق کا شکار۔ تنخواہ محض بیس روبل اور مدرسہ کچھ نہ پوچھئے، اصطبل سمجھ لیجئے یا تہ خانہ اور اُستاد کے پاس ایک ہی کمرہ چاہے اوڑھ لے چاہے بچھا لے ایسے حالات میں تو اگر فرشتہ بھی سامنے آ جائے تو بغیر مار کھائے نکلنے نہ پائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور بچے؟ تو آپ سچ مانیئے۔ اُن میں فرشتے کی سیرت کا تو دُور دُور شائبہ نہیں۔

دیکھئے وہی شخص جو چند لمحے پہلے۔ چیخوف پر اپنے فلسفیانہ الفاظ کے تیھر لڑھکا رہا تھا اور اپنی طوطے نما ناک رونی صورت سے ہلا رہا تھا۔ اُس نے اُس کی سادگی اور اخلاص کے اثر میں آ کر سیدھے سادے پرمعنی اور بہیرے کی کنی کی طرح کٹے چھٹے الفاظ میں اپنا مطلب بیان کرنا شروع کر دیا۔ وہ

الفاظ جو ایک آگ کی طرح اسی گاؤں کی خوفناک اور بھیانک حقیقتوں کو روشن کر رہے تھے۔

جب اُستاد نے اپنے میزبان کو الوداع کہی تو اس نے چیخوف کا چھوٹا مریل سا ہاتھ اپنی کمزور اور پتلی انگلیوں میں تھام لیا اور کہنے لگا "میں تمہارے پاس اس تیاری کے ساتھ آیا تھا گویا میں کسی حاکم کے سامنے پیش ہو رہا ہوں میرا دل خوف سے لرز رہا تھا۔ میں دیگ مرغ کی طرح پر پھڑپھڑا کر اپنے آپ میں ہی مگن ہو رہا تھا۔ میں تم پر یہ ظاہر کرنے آیا تھا کہ میں ایک غیر معمولی انسان ہوں . . . اور اب میں تم سے بطور ایک اچھے گہرے دوست کے رخصت ہو رہا ہوں وہ دوست جو سب کچھ سمجھ رہا ہے۔ اور سب کچھ سمجھ لینا کس قدر شاندار چیز ہے۔ شکریہ میں تمہارے پاس سے ایک دلفریب خیال لے کر جا رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بڑے آدمی سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ ہم چھوٹے آدمی بھی اُن کو سمجھ سکتے ہیں۔ وہ روحانی طور پر ہم لوگوں کے زیادہ قریب ہوتے ہیں بہ نسبت ان بدبخت لوگوں کے جنکے درمیان اکثر ہم رہتے ہیں اچھا خدا حافظ میں تمہیں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔" جب وہ رخصت ہو گیا تو کچھ دیر تک چیخوف اُس کے پیچھے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا کر بولا "کتنا بھلا آدمی ہے۔ مگر میرے خیال میں وہ زیادہ مدت تک اُستاد نہیں رہ سکتا۔" میں نے پوچھا "کیوں" "اجی محکمہ اسے جلد ہی ڈھونڈ لیگا۔ روس میں تو ایک نیک آدمی اس ہوّے کی مانند ہے جس سے مائیں اپنے بچوں کو ڈراتی ہیں"

اُستاد اور اس کے مسائل

(یہ مقالہ ٹیچرز ٹریننگ اسکول رامپور کی ایجوکیشن سوسائٹی میں وہاں کے طلبہ کی فرمائش پر پڑھا گیا)

اُستاد اور اس کے مسائل! لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا اُستاد کے بھی کوئی مسائل ہوتے ہیں؟ اُستاد اور اس کے مسئلے، یہ پکار تو پہلے کبھی سُنی نہ تھی۔ سنتے تھے کہ اقلیدس اور ہندسہ کے مسئلے ہوتے ہیں؟ جنھیں اُستاد لوگ مدرسہ میں بیٹھے سلجھایا کرتے ہیں۔ اکثر منطق اور الٰہیات کے مسئلے بھی ہوتے ہیں جنھیں یہ لوگ اُلجھایا کرتے ہیں اور ان کے بعد اُستاد کیا، وہ ان کے مسئلے کیا! اور پھر مسئلے وعلمائے کرام کا حصّہ ہیں اور اُستاد تو

نہ معتبم نہ فقیہم، نہ محتسب نہ امیر

میرے دوستو! سماج سمجھتی ہے کہ اس نے اُستاد کو مدرسہ کی چہاردیواری میں ہمیشہ کے لئے بند کر کے محفوظ کر دیا ہے۔ علم کی اس کال کوٹھری میں وہ اور اس کے مسائل آپس میں سر ٹکراتے رہیں لیکن اس ٹکراؤ کی گونج مدرسہ کے ایوانوں سے باہر نہ آنا چاہئے۔ تو پھر اُستاد کیا اور اس کے مسائل کیسے

استفسار تبسم کا نشان استفہامیہ بنائے ہمارے سامنے کھڑا ہے کہ زندگی کیا ہے؟ استاد کے سامنے بھی تعلیم کی دبوی اپنے معنی خیز تبسم سے ایک چیلنج ایک اعلان مبارزت پھینک رہی ہے بتاؤ تعلیم کیا ہے؟

اگر زندگی کی تفسیر اکبر الہ آبادی کے یہ الفاظ ہو سکتے ہیں

بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

تو تعلیمی زندگی کی تعبیر اس سے بھی مختصر الفاظ میں پیش کی جا سکتی ہے کہ:

بی ٹی ہوئے ٹیچر ہوئے ساری عمر یوں کو ڈیرا چلتے رہے جیسے چلے کولہو کا بیل

ہیڈ ماسٹر سے جنگ کی، کچھ ساتھ والوں سے رہی اور آخرش پنشن ملی یعنی چھٹی آخر کیل

اور اس رہائی پر ہوئی اتنی خوشی! اتنی خوشی! کہ بس خوشی سے مر گئے ملزم رہا قیدی رہا جیل

لیکن اگر تعلیم زندگی کے مترادف ہے تو اس کے مسائل بھی اتنے ہی ہنگامہ خیز اتنے ہی ہمہ گیر ہونا چاہئیں تعلیم زندگی سے یوں ہم آغوش ہے جیسے دریا کی لہر ساحل سے بغلگیر ہوتی ہے۔ بھلا لہروں کے تلاطم کی دھمک ساحل کے سینہ میں نہیں اُٹھتی۔ میرے دوستو! آج ہمیں تعلیم کو انہیں وسیع معنوں میں لینا ہے۔

ہمارے دیس میں علم اور زندگی کا رشتہ بہت گہرا رہا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جبکہ وہ پورا سماجی ماحول ایک زندگی بخش تعلیمی اثر لئے ہوئے

سماج کہتی ہے کہ ہم نے اُستاد کے لئے کام کرنے کو مدرسہ دیا پڑھنے کو بچے دئے۔ سامنے میز اور پیچھے بیٹھنے کو کرسی۔ اتنا شکر ہے کہ یہ نہیں کہہ دیا کہ کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا بھی دیا! تو پھر اب کونسے مسائل رہ گئے

بھلا جب گھوڑے کے لئے صاف ستھرا اصطبل موجود ہو، گاڑی اور پچھاڑی لگی ہو کبھی کبھی دولتیں جھاڑنے کو دو چار ٹھوکھی ادھر اُدھر بندھے ہوں، جب چلنے کے لئے تعلیمی کوڈ کی وہ جریلی سڑک ہو کہ دونوں آنکھوں پر مقنعے چڑھائے ہوئے بے فکر چلے جایئے اور ہانکنے کو محکمۂ تعلیم کا ہنٹر لگانے کی بھی ضرورت نہیں، ایک ہش کر دیجئے کہ تعلیمی گاڑی بے تحاشہ دوڑنے لگے گی!

سماج سمجھتی ہے کہ اُستاد کیا اور اس کے مسائل کیا اور ہماری برادری بھی ایسی شرمیلی برادری ہے کہ ان کے چہرے ہمہ تن سوال۔ ان کی صورت ہمہ تن مسائل لیکن اس سوال کو معرض بیان میں لانے کے لئے نہ تو ہمت ہے نہ سکت۔

میرے دوستو! اب وقت آچکا ہے کہ ہم بتائیں اُستاد ایک حقیقت ہے اور اس کے مسائل زندہ حقیقتیں! استاد کے مسائل، مدرسے کے مسائل۔ مدرسے کی چہار دیواری کے مسائل نہیں ہیں استاد کے مسائل زندگی کے مسائل ہیں۔ جیسے زندگی کا ابوالہول ایک معمہ طلب۔ ہمہ

تھا اس میں تعلیم و تربیت کی وہ خوشگوار لیکن نامعلوم سوتیں جاری تھیں جو فرد کو اپنے دامن میں یوں لپٹائے ہوئے تھیں جیسے کسی محبت بھری گود میں بچہ ہلکورے لے رہا ہو۔ زندگی اور تعلیم ایک مسلسل اور مربوط سلسلہ تھا ایک کی نامعلوم اور بے پناہ وسعتیں دوسری میں یوں سرائیت کرتی جاتی تھیں۔ جیسے جھٹپٹے کے دھندلکے میں پتہ نہیں چلتا کہ اندھیرا کہاں ختم ہوا اور اُجالے کی حدود کہاں شروع ہوئیں۔ تعلیم اور زندگی دو ایسے جزیرے نہ تھے جن کے مابین ایک دریائے ذخار اپنی طوفان خیز موجیں اُٹھائے ہوئے ہو۔ اگر ایک دریا تھا تو دوسرا ساحل۔ اگر ایک چولی تو دوسرا دامن۔

لیکن پچھلے سو سال سے ہمارے دیس میں ایک نئی تعلیم کا آغاز ہوا۔ وہ تعلیم کسی دوسری فضا میں اچھی تعلیم تھی۔ کامیاب تعلیم تھی لیکن میرے دوستو کبھی تعلیم کی کامیابی کا معیار زمان و مکان ماحول اور فضا کی پابندیوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ بھلا ایک دیو قامت پیپل کا درخت جو منطقہ حارہ کی ہواؤں کی گود میں پل کر برگ و بار لایا ہے۔ جس کے پتے اس کی زندگی بخش گرم ہواؤں میں پھیلے اور پھیل کر سبز روشنی کا بقعہ نورین کر رہ گئے۔ کیا یہی پتے شمال کی سرد ہواؤں میں سمٹ کر ان سوئیوں جیسے تیز نشتر نہ بن جائیں گے جن سے ان دیسوں کے درخت برفانی طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہیں؟ کیا منطقہ معتدلہ کے خطوں کا عطر بیز گلاب جب شمالی آب و ہوا میں پہنچایا جاتا ہے تو اپنی بو باس

نہیں کھو دینا، میرے دوستو! جب نباتی اشیا پر ماحول اور فضا کا اثر مسلم ہے۔
تو نظامِ تعلیم جو مادی رشتوں سے زیادہ دقیق زیادہ نازک واسطوں کے ذریعہ
اپنے سماجی اور کلچرل ماحول سے وابستہ ہے، کیسے اس مسلمہ سے بالا ہو سکتا ہے
میرے دوستو! ایک غیر معمولی طریقۂ تعلیم کو اس ملک میں رائج کرنے کے سلسلے
میں لوگوں نے وہی غلطی کی جو ایک معمولی کسان یا باغبان بھی نہیں کرتا۔ اس کا جو
نتیجہ ہوا وہ سب پر ظاہر ہے تعلیم اور زندگی کا وہ نازک رشتہ سیاستدانوں
کے غیر ہمدردانہ سلوک کی تاب نہ لا سکا۔ اس کے ریشے آہستہ آہستہ
ٹوٹتے گئے اور ان دونوں میں ایک غیر شعوری اور نامعلوم طور پر خلیج پیدا ہو گئی
ہمارے ملک میں تعلیم اور زندگی جھیل ڈل پر دو تیرتے ہوئے جزیروں کی
طرح تھے۔ جن میں کشش عنایب شعری ایک ذرہ کو دوسرے ذرہ سے
وابستہ اور منسلک کرتی ہے، آہستہ آہستہ یہ طاقت منتشر ہوتی چلی گئی اور
ہمارے تعلیمی جغرافیہ میں ایک طرف زندگی عوام کی زندگی ایک صحرائے ناپیدا کنار
ایک ریگستانوں کا سلسلہ ایک بنجر وادیوں کا ہجوم بیچ میں ایک خلیج اور
دوسری طرف نئی تعلیم کا نخلستان۔ میرے دوستو اس عظیم الشان خلیج کا پاٹنا آسان
کام نہ تھا میں جانتا ہوں کہ پچھلی صدی نے چند ایسے دیو قامت اطلس
پیدا کئے جنہوں نے اس وسعت کو پانے کی کوشش کی۔ وہ عظیم الشان
شخصیتیں جن کی پیامبرانہ نگاہ نے اس روزانہ بڑھنے والی خلیج کو پالیا تھا۔

جن میں ایسی انتھک خود اعتمادی تھی کہ انھوں نے اس نخلستان سے دوستی اور محبت کا ہاتھ بڑھایا تو ایسی بھیانک کھاڑی کو پار کر گیا جو عوام اور خواص کے مابین حائل تھی مگر پھر بھی انگریزی تعلیم والوں کو نئی دقتوں کا سامنا ہوا کوئی پودا ہم آہنگ آب وہوا کے بغیر پروان نہیں چڑھا اور کوئی نظام تعلیم ایک شیش گھر میں رہ کر پنپ نہیں سکتا۔ جب اس کے مصنوعی طریقوں سے کاشت کئے ہوئے پودوں کو صحرا کی سموم کا سامنا کرنا پڑا تو پہلے جھونکے میں ہی سنولا کر رہ گئے۔ ان میں زندگی کے لئے وہ ابدی اور مستقل اقدار کا احساس پیدا نہ ہوا جن سے حیات ابدی کی ہمک اٹھی ہے اور جن کی صحیح پرکھ اور جانچ اصل مسرت کا راز ہے۔

کومینیس مشہور تعلیم داں نے مدرسہ کو انسانوں کی بھٹی کہا ہے۔ اگر مدرسہ بھٹی ہے۔ اگر ہماری درسگاہیں وہ لپکتا ہوا شعلہ ہیں جس میں تعمیر حیات کا عمل جاری ہے تو اسے زندہ رکھنے والی دھونکنی ہماری سماج اور کلچرل زندگی ہے جب تک اسے سانس ملتا رہے گا۔ یہ زندہ ہے جس دن سانس بند ہو جائے گا یہ شعلہ بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا تو دوستو! ہمارے نظام تعلیم کی تشکیل کرنے والوں نے دھونکنی تو بند کر دی اور امید یہ رکھی کہ بھٹی کا شعلہ جوں کا توں لپکتا رہے گا تعلیم کا سچا اور وسیع مقصد محض مدرسہ پورا نہیں کر سکتا۔ مدرسہ تو سماجی اور معاشی زندگی کا ایک محدود اور تنگ ادارہ ہے۔ جو محض کتابی

تعلیم کے لئے وقف ہے لیکن وسیع معنوں میں تو پوری زندگی ایک دبستان علم وعمل ہے اس کے مختلف اداروں سے شخصیت کی اُٹھان اور اس کی تکمیل نشوونما پاتی ہے۔ زندگی کے ابتدائی دوروں میں انسان قبائلی گروہ میں رہتا تھا اور اس کی نئی پود غیر کتابی طریق تعلیم کی گود میں پلتی اور پروان چڑھتی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ مدرسوں کی چار دیواری میں ان کے ضوابط اور بندھنوں کی پابند ہوتی گئی۔ سب سے پہلے جس انقلاب آفریں معلم نے کتابی تعلیم کی بڑھتی ہوئی زنجیروں کو جھڑ جھڑایا وہ روسو تھا۔ اس کی فطری تعلیم کی صدائے بازگشت اب تک وقت کے ایوانوں میں ٹکرا رہی ہے لیکن مدرسہ کو سماجی لحاظ سے زندہ حقیقت بنانے کا سہرا بیسویں صدی کے سر ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جب تک زندگی کی گرم اور ولولہ خیز لہریں مدرسہ سے یوں ہم آغوش نہ ہو جائیں جیسے کہ ایک محبت بھری ماں کی گود بچے سے ہوتی ہے۔ اس وقت تک مدرسہ میں زندگی کی حرارت گھر نہیں کر سکتی۔

میرے دوستو! آج ہمارے دیہی مدارس میں جو عام بے حسی اور زندگی سے سرد مہری پائی جاتی ہے اس کی بڑی وجہ یہی بڑھتا ہوا بُعد ہے جو مدرسہ اور زندگی میں پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہمارے تعلیمی امداد و شمار کا مقیاس الحرارت صریحاً بتا رہا ہے کہ ابتدائی مدرسہ کی چار دیواری سے نکل کر فارغ التحصیل طلبہ کا معیار کس تیزی سے گرنے لگتا ہے۔ ہماری نئی نسل

کی اکثریت مدرسہ سے باہر آکر یوں ٹمٹماکر رہ جاتی ہے جیسے دیوالی کا جھنڈول کسی جھکڑ میں آگیا ہو۔

لیکن ایک زمانہ ایسا تھا کہ ہمارے مکتبوں کا فارغ التحصیل طالب علم باہر نکل کر اس سیاح کی طرح محسوس نہ کرتا تھا جس کے نتھنے گو وہ ہمالیہ کی بلندیوں پر پہنچنے سے پھولے جارہے ہیں اور جس کا دم ہوا ہلکی ہونے کی وجہ سے گھٹتا جارہا ہے۔ اس کے برعکس اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی ایسی زندگی بخش فضا میں پہنچ گیا ہے جس میں علم و ہنر کی وہ سوتیں جن کے سرچشمے مدرسہ نے کھولدئے تھے اب پوری قوت اور بہاؤ سے چل نکلیں گی۔ وہ زمانہ ایسا تھا جب ہمارا سماجی اور معاشی ماحول تعلیمی اثرات سے یوں تنا ہوا تھا جیسے کسی کان کی فضا رقیق مادوں کی آمیزش سے آتش در آغوش ہوتی ہے۔

ایک زمانہ میں آپ کے اپنے شہر میں ہی چند اسباب سے کچھ ایسی فضا پیدا ہوگئی تھی۔ جس نے پورے شہر کی فضا کو وسیع اور عالمگیر معنوں میں تعلیمی بنادیا تھا۔ انھیں معنوں میں جس میں ایتھنز ایک زمانہ میں عروس البلاد کہلاتا تھا یا غرناطہ شہروں کا سردار۔

کائنات کا وہ ترنم جس کے ہمہ گیر اثر سے صبح و شام، چاند اور سورج بھی بچ کر نہ نکل سکے۔ اس شہر میں پوری فضا کو تھرتھرا رہا تھا۔ رامپور کے موسیقی اسکول نے اس فن لطیفہ کی روایات کو ہی حیات جاوید نہیں بخشی اس

کے ترنم نے عوام کے دلوں میں وہ سکون اور کیف، توازن و تناسب کی وہ روح پھونک دی جو یونانی اخلاقیین کے نزدیک کامیاب زندگی کا اصل راز ہے۔ کتھک اسکول نے تربیت سمع کے ساتھ تہذیب نگاہ کا سامان بھی فراہم کیا یہ حسن صوت کی بجائے پورے اعضاء انسانی کی شاعری تھی۔ میرے دوستو! ایسی مترنم فضا میں جہاں قدرت کا گرانبار عطیہ جسم انسانی خود ایک مجسم شعر اور پوری فضا ایک نغمہ ہو کون متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔ یہ فضا وسیع معنوں میں تعلیمی فضا تھی۔

کچھ سال ہوئے ایک ولایت کے ماہر تعلیم نے ان ہی صوبجات کے مدرسوں کا دورہ کیا اور دورہ کے بعد انھیں یہ احساس ہوا کہ ہمارے مدرسوں میں مسرت اور خوشی کی فضا نہیں۔ ہمارے درس بے کیف۔ ہمارا ماحول بے سرور ہے۔ اگر اس قسم کا ماحول جس کا میں نے ذکر کیا ہے ایک حد تک معصومانہ انداز میں ہم بچوں کی دنیا میں پیدا کر سکتے تو شاید ہم پر سے یہ الزام دھل جاتا۔ بہرحال آپ دیکھیے کہ ہمارے پرانے تمدن میں ایک حد تک زندگی اور تعلیم کس طرح ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دئے شانہ بشانہ گامزن تھیں آج ہماری یونیورسٹیوں میں ہندوستانی موسیقی کے اسکول کھولے جا رہے ہیں۔ ہمارے ماہرین تعلیم میں یہ احساس لطیف کافی دیر کے بعد بیدار ہوا ہے تاہم میں کہوں گا کہ علم موسیقی میں اعلیٰ اسناد پائے ہوئے حضرات (اور اب تو موسیقی

کے تصور کو جو حقیقتاً تعلیمی دنیا کے لئے اسلام کا خاص عطیہ ہے۔ ایک روشن حقیقت بنا کر دکھا دیا تھا۔ وہ قندیل علم جس کی لو پر اصفہان، خوارزم بخارا اور ترکستان سے پروانے کھنچے چلے آتے تھے۔ جو خواص اور عوام دونوں کے لئے سرچشمۂ ہدایت تھا۔ وہ ایسا خزینۃ العلوم تھا جس کی موتی ان آبشاروں کی طرح تھیں جو مسلمانوں کے عہد میں ان کی حسن اندیشی سے ہر چمن اور ہر پائیں باغ میں جاری وساری تھیں۔ اس کے اساتذہ نہ صرف علمی دنیا میں بلکہ باہر کی دنیا میں بھی ایک مخصوص حیثیت رکھتے تھے۔ آج نگاہیں انھیں ڈھونڈھتی ہیں تعلیمی دنیا میں ان کے منصب ان کے رتبے کو تلاش کرتی ہیں لیکن نہیں پاتیں! مولوی عبدالعلی فرنگی محلی بحرالعلوم علم و فضل کا وہ دریائے ذخار جو اپنی زندگی کے ایک دور میں دکن پہنچا ٹیپو نے ان کی پالکی کو کندھا دے کر سعادت دارین حاصل کی۔ مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی خیرآباد اسکول کے فلسفیانہ روایات کو زندہ رکھنے والے بزرگ، وہ نازک مزاج اور آزاد منش عالم جن کی وضعداریوں کو کچھ رامپور کی سرزمین ہی خوب نباہ سکی۔ جن کے لئے والیٔ ملک نے اپنے خزانے کا منھ کھول دیا تھا جن کی نفاست طبع اور حسن ذوق کے بار کو رامپور کی قدر دانی اور فیاضی ہی اپنا سکی۔ وہ جب روٹھے تو والی ملک کے منانے سے منے اور جب تنے تو ایک زمانہ کے چہرے پر تبسم کھیلنے لگا میرے دوستو! آپ کے شہر میں اس قسم کے زندہ دل اور والے تھے۔ جن

میں ڈاکٹری کی سند بھی ملنے لگی ہے۔ اس فن لطیف کو پرکھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں اتنے کامیاب نہ ہوں گے جتنا رامپور کا ایک شہری۔

اور اس کے بعد آپ کا مشاعرہ ہے۔ وہ موثر تعلیمی ذریعہ جس کی امداد سے عوام کا ادبی کلچرل معیار اونچا ہو جاتا تھا۔ پانی کے سیلاب کے برعکس ان ادبی کاریزوں کی سطح خواص کے معیار علم کا مطابق بلند ہوتی تھی اور اپنے ساتھ عوام کے خس و خاشاک جیسے مذاق کو بھی بلند کر دیتی تھی اس دلچسپ اور محبوب ذریعہ سے عوام میں توازن صوت کے ساتھ ساتھ تناسب خیال کا بھی عام مذاق پیدا ہوتا تھا۔ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ پچھلے زمانہ کا وہ ان پڑھ شہری جس نے اس تاریخی شہر میں غالب اور امیر مینائی، جلال اور داغ کی آنکھیں دیکھیں ہوں گی حسن مذاق اور ذوق سلیم میں آج کل کے کتنے لکھے پڑھوں سے بڑھا ہوا ہو گا۔ ہمارا ادب کتنی ایک مثالیں ان شعرا کی مہیا کرتا ہے جنھوں نے ایک عرب بدو کی طرح فطرت کی گود میں یا ایک کلچرل ماحول سے متاثر ہو کر شاعری کی اور ایک حد تک کامیاب شاعری کی۔

اور ان سب کے بعد لیکن ان سب سے اہم مدرسہ عالیہ رامپور ہمارے پرانے نظام تعلیم کا وہ روشن چراغ ہے جس نے ایک اندھیاری دنیا میں ایک ڈھلتے ہوئے زمانہ میں علم و ہنر کی کرنیں دوڑا دیں تھیں جس نے ہمارے ملک میں غرناطہ اور بغداد کی روایات زندہ کر دیں تھیں۔ جس نے یونیورسٹی

سے لہریں اُبھر ابھر کر پورے ماحول کو مرتعش کر رہی تھیں۔ آپ نے بزرگان دین کی تصاویر میں دیکھا ہوگا کہ ان کے چہرے کے گرد چاند کا ہالہ بنا ہوتا ہے۔ اس قسم کا غیر محسوس اور غیر مرئی دائرہ فیضان ہر عالم اور ہر ادارے کا ہوتا ہے۔ عوام کے دلوں پر غیر شعوری اور شعوری طور سے ان کی ضیا منعکس ہوتی رہتی ہے۔

ہمارے پرانے اداروں، ہمارے پرانے اساتذہ میں یہی خوبی تھی کہ وہ صحیح معنوں میں اخلاقی اور کلچرل لحاظ سے اس قسم کے مراکز نشر تھے جہاں سے علم و فضل کی لہریں اٹھتی تھیں اور پورے ملک کو شاداب و سرسبز کر دیتی تھیں۔

آپ کہیں گے کہ آخر ان اداروں کی کامیابی کا راز کیا تھا؟ یہ وہ ادارے تھے جو اپنے محدود دائرے میں ہماری سماجی اور مذہبی زندگی کے فطری اور طبیعی نتائج تھے۔ یہ ادارے فطری جوش نمو سے ایک زرخیز مٹی سے اُگے اور اپنے برگ و بار سے مادر گیتی پر سایہ فگن ہوئے۔ ان کے اساتذہ کے درس بھی وہ سبق نہ تھے جو ایک شرمایا لجایا سا اُستاد۔ احساس خودی کی گھبراہٹ سے بے چین اور پریشان اُستاد، ایک مدرسہ کی چار دیواری کے اندر محفوظ کر دینا چاہتا ہے یا ایک جھلملاتی ہوئی مشعل کی طرح جسے کوئی دونوں ہاتھوں سے ڈھانپے ہوئے ہو، ان اساتذہ کے درس فیضان قدرت کے کھلے خزانوں کی طرح جاری، چاند اور سورج کی طرح ضیا فگن، بادل کی طرح گوہر بار تھے ان کے اساتذہ برنارڈ شا کے اساتذہ نہ تھے جس نے کہا ہے کہ "جسے کچھ آتا

ہے کرتا ہے اور جسے کچھ نہیں آتا پڑھاتا ہے"۔ میرے دوستو! یہ اساتذہ صحیح معنوں میں اساتذہ تھے ملک وقوم کے اخلاقی اور علمی لیڈر تھے۔ ہمارے پیشہ کو ان سے فخر تھا انھیں ہمارے پیشہ سے افتخار حاصل نہ تھا۔

آپ اس داستان پارینہ کو سنتے سنتے اُکتا گئے ہوں گے لیکن نقش اس کے پس منظر کے ذریعہ سے ہی زیادہ روشن زیادہ معنی خیز ہو سکتا ہے اور ہر سماجی عمل اس کے تاریخی ماحول کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ ایک اجلے براق کپڑے پر سیاہ دھبے کتنے نمایاں کتنے بدنما معلوم ہوتے ہیں لیکن صبح کے وقت پورب سے اُبلتی ہوئی روشنی میں اُفق کے درختوں کے برگ وبار کتنے واضح ہوتے ہیں۔

میرے دوستو! میں اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ پچھلے زمانے میں اُستاد کے محدود معاون، کتنے وسائل، کس قدر ذرائع تھے۔ آپ نے دیکھا کہ تعلیم خود زندگی سے گہرے انداز میں مربوط تھی۔ نصاب اور ذریعۂ تعلیم ہمارے تمدن کا سرہون منت تھا۔ بچہ اگر مکتب سے محض نوشت وخواند سیکھ کر آتا تھا تو سماجی ماحول میں وہ زندگی بخش اثرات موجود تھے جو اسے حسن ذوق اور طبع سلیم اور جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے ایک شگفتہ شخصیت عطا کر دیتے تھے۔ پھر پرانے زمانے میں اُستاد یا گرو کا مرتبہ خود حقوق، وقار، اثر اور رُتبہ کا ایک جہاں گھیرے ہوئے تھے۔

اس پس منظر کے آئینہ میں نئے اُستاد کو دیکھو، اس دل بٹھا دینے والے

ماحول کو دیکھو جس میں وہ کام کر رہا ہے۔ سماج میں اس کی جگہ کو دیکھو جو اسے نصیب ہوئی۔ اس کے مالی معاوضہ کو دیکھو جو چوکیدار سے کچھ زیادہ اور پٹواری کی آمدنی سے کہیں کم ہے اور اس کے بعد دل پہ ہاتھ رکھ کے بتاؤ کیا دوبارہ تم وہی الفاظ ہی شانِ استغنا سے دہرا سکتے ہو کہ اُستاد کیا؟ اور اس کے مسائل کیا؟ اُستاد کے سامنے تعلیمی پس منظر کچھ بھیانک سا ہوتا جا رہا ہے۔ قدیم روایات کے ستارے ایک ایک کر کے اُفق کے پیچھے ڈوبتے جا رہے ہیں۔ اور ان کی جگہ کوئی نئی اُمیدیں اُبھر نہیں رہی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری تربیت گاہیں اُستاد کو ان نئے حالات میں ایک نئے تعلیمی جہاد کے لئے کہاں تک تیار کر رہی ہیں؟

کسی نے کہا ہے بچہ کو بالغ بنانے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم بچے کو بچہ بننا سکھائیں، اور اُستاد کو اُستاد بننے سے پہلے ضروری ہے کہ اسے انسان بننا بتائیں۔ ہر پیشہ انسان کی عملی زندگی کے کسی ایک آئیڈیل کی نمائندگی کرتا ہے، اور جب ہم ان اعلیٰ تصوری مقاصد کو اداروں میں مقید کرنا شروع کر دیتے ہیں تو حبس کے سایے ان پر گہرے ہونے لگتے ہیں وہ واتنی روشنی جو ان میں جھلملا رہی تھی آہستہ آہستہ مدھم پڑتی جاتی ہے اور بتدریج ہمارے ادارے ہمارے آئیڈیل کے مقبرے ہوتے جاتے ہیں۔

مجھے ڈر ہے ہمارے ملک کے ٹریننگ کالجوں پر بھی ایک حد تک یہی الزام عاید ہو سکتا ہے۔ ان اداروں میں آزادی اظہار شخصیت اور نشاط

عمل کی خوش آئند صدائیں اٹھتی ہیں اور ان کی چار دیواری سے ٹکرا کر رہ جاتی ہیں مجھے اپنا پرانا کالج یاد ہے۔ جہاں ہمارے کمرے بارکیں، ہمارے اُستاد اسٹاف ممبر، ہماری ریاضت، جسمانی ملٹری ڈرل کہلاتی تھی۔ اتنا شکر ہے کہ انھوں نے ہمارے ورزش ماسٹر کو ڈرل سارجنٹ اور ہمارے بورڈنگ سپرنٹنڈنٹ کو کوارٹر ماسٹر جنرل کا خطاب نہیں دیا تھا۔ یہ بھی شاید انکساری تھی کیونکہ ظاہر میں تو یہ دونوں اُستاد ان فوجی افسروں سے کم نہ تھے۔ حیرانی ہے کہ ایک ہاتھ سے ہم آزادی کا گراں بہا عطیہ بچہ پر بھی نہیں ہر بالغ شہری پر نچھاور کر رہے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے وہی فطری حق اُستاد سے چھین رہے ہیں

جس استاد سے ایک ذمہ دار انسان کی طرح سلوک نہیں کیا گیا جسے اپنے اوپر بھروسہ کرنا نہیں سکھایا گیا۔ جسے ایک سخت ضبط کے فولادی شکنجہ میں رکھا گیا۔ جسے کبھی تخلیقی خود اظہاری اور سماجی خدمت کا موقع نہیں دیا گیا۔ وہ کیسے ایک نئی تعلیم کا علمبردار ہو سکتا ہے۔ ایک نئی تعلیم نہیں ایک نئی زندگی کا وہ بچوں کو ایک نئی سماج۔ ایک نئے جمہوری نظام کے لئے کیسے تیار کر سکتا ہے۔

مگر میں ان پرانے فرسودہ اداروں میں ان کی سنگین دیواروں میں بھی رخنے پڑتے دیکھ رہا ہوں۔ کہیں درزوں اور شگافوں میں سے نئے اصولوں کی روشنی پھوٹ نکلی ہے۔ آپ لوگ جو ایک نئی تربیت گاہ میں کام کر رہے ہیں خوش قسمت ہیں۔ آپ کے ادارے کی اُٹھان نئی تعلیم کے دور میں ہوئی ہے

پُرانے ادارے قدم آگے بڑھانا چاہتے ہیں لیکن ان کی نگاہیں ماضی کی طرف لگی ہوئی ہیں اور پُرانے ضبط اور روایات کی بھاری بھرکم زنجیریں ان کے پاؤں میں ہیں۔

اسی طرح مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس روشن خیال تربیت گاہ سے باہر جاکر تم بھی کبھی کسی ایسے مرقدگاہ میں نہ پہنچ جاؤ جہاں کے مجاور کوئی پُرانا ہیڈ ماسٹر جہاں کا سجادہ نشین کوئی سال خوردہ سکریٹری ہو۔ جس پر پُرانے تجربوں کی اتنی تہیں چڑھ چکی ہوں کہ وہ خود تعلیمی اُصولوں کا ایک چلتا پھرتا تابوت ہو۔ وہ ہیڈ ماسٹر جو آپ کو اسکولی زندگی کے پہلے دن ہی ایک مربیانہ انداز میں تھپک کے ایک گوشے میں لے جائے اور تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس انداز سے کہے گا گویا تعلیمی زندگی کے معنوں کو ایک تو اس نے سمجھا ہے اور کچھ کچھ اس کی امداد سے تم سمجھنے کی کوشش کر رہے ہو وہ یہ کہے گا دیکھو بھیا! اپنے ٹریننگ اسکول کی باتوں کو ذرا تہہ کر کے رکھ دو۔ تمہارے سامنے یہ اصل زندگی ہے زندگی، یہاں ٹریننگ کالج کی ہوائی باتوں سے قلعہ سر نہیں ہوتا۔ بچوں کو پڑھانے کا بس ایک ہی طریق ہے۔ میاں باقی جتنے طریقے تم نے سیکھے ہیں۔ وہ ان نئی تعلیم والوں کے چوچلے ہیں جیسے ہمارا خدا ایک ہے اور رسول ایک ہے۔ پڑھانے کا طریق بھی ایک ہے اور وہ ہے ضبط اور اس کے گُر دو ہیں ایک تو لونڈے کو جماعت میں کبھی شرارت نہ کرنے دو اور دوسرا (ذرا کھانس کر) دیکھنا

یہ بہت اہم ہے اگر اسے نظر انداز کر دو گے تو دھوکا کھا جاؤ گے۔ دوسرا یہ کہ کسی بچے کو جماعت میں کبھی سونے نہ دو۔ اگر تم نے ان دونوں اُصولوں کا دھیان رکھا تو دیکھ لینا کہ چند روز میں بچوں کا ناک میں دم آ جائے گا واللہ ناک میں دم اور وہ جماعت میں صرف وقت گذارنے کے مقصد سے اس بے جگری سے کام کریں گے گویا زر خرید غلام ہیں یہ ہے تیس سال کے تجربے کا نچوڑ۔ میرے دوستو! تم نے شاید پولیس کے تھرڈ ڈگری طریقے تو سُنے ہوں گے یہ تعلیمی تھرڈ ڈگری ہے۔

اور اپنے نارمل اسکول کے جوش وولولہ کے بعد یہ برفانی غسل۔ اس سرد آبی کے بعد جب اپنے ساتھیوں اپنے شرکائے کار کو دیکھو گے تو نظر آئیگا کہ ان میں سے بشتر ایسے ہیں جن میں زندگی کا شرارہ بھڑکا کیا سسکیاں بھی نہ لیا ہوگا۔ بلکہ سالوں پہلے جل بجھ کر ٹھنڈی راکھ بن چکا ہوگا۔ یہ لوگ کم تنخواہ پر کام کر رہے ہوں گے اور اس کمی کا احساس ان کے چہروں پہ نمایاں ہوگا نہ تو ان کے ماتھے پر عزم صحیح، نہ ان کی نگاہوں میں جوش اور ولولہ نہ وہ چمک اور ذہنی جھلک جو نئی پود کے قایدین اور ان کے راہنماؤں کا حصہ ہوتی ہیں۔ اُستادی کا پیشہ ان کے لئے کیا ہے۔ ایک طوفان سے بچے ہوئے کی آخری پناہ گاہ۔ کشمکش کا وہ طوفان جس کی تباہ کاری اپنے پیچھے نہ تو ذہن بیداری چھوڑتی ہے اور نہ علمی ذوق ہی!

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ یہی لوگ اپنے مدرسوں میں طلبا کی برادری کے شاندار ستارے تھے ان کے دل بھی جوش اور ولولہ سے لبریز تھے۔ انھوں نے بھی اعلیٰ امتیازات حاصل کئے تھے۔ ان کے سینوں میں بھی زندگی کا طوفان اپنی قوت سے تلاطم خیز تھا۔ ان میں بھی شوق عمل تھا ذوق جستجو تھا۔ اور یہ اب کیا ہیں؟! اب مدرسے نے انھیں ایسے چوس لیا جیسے کسی ندیدہ بچہ نے سنگترے کی پھانک کو چوس لیا ہو۔ انھوں نے اسکولی زندگی کا تھکا دینے والا راستہ گرتے مرتے طے کر ہی لیا اور اس طوال طویل سفر کو پورا کرنے کے بعد ان کے سامنے کیا تھا۔ ایک کم مایہ پنشن یا پراویڈنٹ فنڈ کا نخلستان!!!

تمہارے سامنے پورا مدرسہ ہوگا۔ اس کا پورا ماحول ہوگا تمہیں محسوس ہو رہا ہوگا کہ پورے منظر پر اوس سی پڑی ہوئی ہے، وہ اوس جو گرم سے گرم جوش کو بھی ٹھنڈا کر سکتی ہے لیکن شاید اس افسردگی میں کسی ایک نے اپنے دل کی حرارت کو محفوظ رکھا ہو۔ کوئی ایک ایسا شریک کار جو اس تاریک ماحول میں بھی زندگی کی مدہم لو کو دونوں ہاتھوں سے اوٹ کئے ہوئے سینے سے لگائے کھڑا ہو شاید ایک دن وہ تمہارا دامن پکڑ کر کھڑا ہو جائے۔ اس کی وہ آنکھیں جن میں زندگی کی جھلک مدہم پڑتی جاتی ہو۔ ایک لمحہ کے لئے چمک اٹھیں اور روشنی کے مینار کے اس پاسبان کی طرح جو تن تنہا ایک شمع لئے جزیرے سے بھٹکتے ہوئے ملاحوں کو راستہ دکھا رہا ہو۔ روح کی اس خوفناک

تنہائی میں جہاں وہ اپنے آپ سے بھی بات کرتا ہوا گھبراتا ہو، شاید ایک دن وہ تمہارا دامن تھام لے اور کہے کہ دوست آج میں تمہیں سچ سچ بتا دینا چاہتا ہوں۔ سب کچھ سچ سچ اپنی روح کی بھلائی کے لئے سب کچھ سچ سچ اگر سچ پوچھو تو اب تک ہم نے کبھی کسی روح کی بھلائی کی پرواہ تک نہیں کی تھی، مگر خدا جانے آج رہ رہ کر مجھے تمہارا خیال کیوں آ رہا ہے اور اس لیے میں تم سے دو باتیں کر لینا چاہتا ہوں۔ میرے نو عمر دوست میں تم سے دو باتیں کہہ دینا چاہتا ہوں۔ بس ایک، اور وہ یہ کہ یہاں سے بھاگو خدا کے واسطے یہاں سے کہیں باہر نکل جاؤ۔ ایسی تیزی سے اتنی کوشش سے نکل جاؤ جیسے کہ تم اپنی جان بچا کر بھاگ رہے ہو۔ میرے عزیز یہ تمہارے جسم کا مسئلہ نہیں، یہ تمہاری روح کا سوال ہے۔ بھاگو جلد بھاگو، اس سے پہلے کہ اس ادارے کی زندگی کا سایہ تمہاری روح پر پڑنا شروع ہو جائے۔ اگر نہ بھاگو گے تو دیکھ لینا ایک سال تک نہ تم ہو گے نہ تمہاری روح۔ تم مجھے اور دوسروں کو زندہ سمجھ رہے ہو۔ کیسی بھلی خوش فہمی ہے۔ میرے دوست ہم تو مردہ ہیں سولہ آنے مردہ ہیں ہم تو سالہا سال سے مردہ چلے آ رہے ہیں اور دیکھو میں تمہیں یہ بات ہرگز نہ بتاتا۔ لیکن کیا کروں سالہا سال کی مردنی سے میرے دل میں ہوک اٹھتی ہے۔ میں زندگی کی آخری منزلوں میں ڈگمگا رہا ہوں۔ میں کیا اور کیا میری زندگی! اگر تم جو اس سفر میں بھی نئے شوق سے قدم بڑھا رہے ہو، خدا نہ کرے کہ تمہیں نظر

لگ جائے۔ میں یہ سب باتیں تم سے ہرگز نہ کہتا مگر میرے دوست سالوں کے المیہ اور دردناک تجربے نے ان پر حقیقت کا رنگ دیدیا ہے میری زندگی کے بلند بالا نخل میں وہ داغ دئے ہیں جن کے کچوکے میں خود ہی خوب جانتا ہوں میں خود نہیں سمجھتا کہ میں تمہیں خواہ مخواہ کیوں تنگ کر رہا ہوں مگر اب تو چوہیں نے شروع کیا ہے۔ اس کو سُن لو۔ دیکھو بعد میں یہ نہ کہنا کہ تم سے کسی نے کہا نہ تھا۔"

میرے دوستو! پہلے مسائل ہمارے اصول تعلیم کے مسائل تھے۔ یہ تمہاری عملی تعلیم کے مسائل ہوں گے۔ ان مسائل سے گھبرانہ جانا سنا ہے کہ دریا کا بدترین تلاطم نزدیکی ساحل کا پتہ دیتا ہے اور رات کا تاریک ترین حصہ صبح کے اجالے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

تعلیمی دُنیا میں ایک نیا آسمان اُبھرتا چلا آرہا ہے۔ یہ ستارۂ آزادی بچے کی آزادی کا ستارا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اُنیسویں صدی انسانیت کی کی جمہوریت کی صدی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بیسویں صدی بچہ کی آزادی کی صدی ہے۔ اس ستارے کی کرنیں ابھی ابھی اُفق سے اُوپر روشن ہو رہی ہیں انھوں نے اب تک ان اداروں کو جگمگایا ہے جو ہماری تعلیمی دُنیا کی چوٹیوں پر بنے ہوئے ہیں۔ ابھی اس کی گرم محبت بھرے بوسوں نے ان کے میناروں اور گنبدوں پر کندن جیسا رنگ دوڑا دیا ہے۔ مگر دوستو! فطرت کے کوہساروں میں بھی ایورسٹ یا کنچن جنگا تو ایک دو ہی ہوتی ہیں مانا کہ ان

کی بلندیوں میں ایک ۔ وماں ہے، ان پہ آکاش کے دیوتا آنکھ مچولی کھیلتے ہیں
گر اصل زندگی کی شادابیاں ۔ اس کے گرجدار نغمے ، اس کی سنگین دشواریاں
اس کی جاندار پُرشکوہ آبشاروں کی گونج وادیوں میں ہی ہوتی ہے۔ میرے
دوستو! ہمارے ملک کی تعلیمی وادی بھی وادیٔ مرگ سے کم نہیں ۔اس نئی صبح
کا دھندلکا ابھی تک اس کی بے پناہ گہرائیوں ، اس کی دھند اور اندھیا لے
کو پار نہیں کر سکا ہے ۔ ابھی تک تو صرف اتنی روشنی ہے کہ جس سے ہمارے
اندھیرے کا احساس اور بھی گہرا ہو گیا ہے ۔ میرے دوستو اسی احساس اسی
بے چینی ۔ انہی موجودہ تعلیمی حالات سے ردعمل میں ایک نئی تعلیم بلکہ ایک نئی زندگی
کا پیغام چھپا ہوا ہے ۔

ان حالات میں اُستاد کا کام کیا ہے ۔ اس کا کام یہ ہے کہ اس اندھیرے
میں بھی اپنی نگاہ ان ستاروں پر لگائے رکھے جو دور سے اسے منزل
مقصود کا پتہ دے رہے ہیں لیکن میرے دوستو جو ستاروں پر ہی نظر جمائے
رکھے گا ممکن ہے کبھی ٹھوکر کھا کر گر جائے ۔ یہ سچ ہے کہ ہماری نگاہ ستاروں پر ہی جمنی
چاہیئے مگر دوستو ہماری زمین بھی تو ایک ستارہ ہے ۔ اچھا اُستاد ، کامیاب اُستاد
وہی ہے جو سماوی ستاروں اور ارضی ستارے کے بیچوں بیچ وہ راستہ ڈھونڈ
نکالے جو کہکشاں کی طرح اسے منزل مقصود تک پہنچا دے ۔

میرے دوستو! تعلیمی شاہراہ پر سب سے شاندار روشنی کا مینار تعمیر

حیات کا مینار ہے دوسرے مانیں یا نہ مانیں مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُستاد کا پہلا اور سب سے اہم فرض تعمیر حیات ہے۔ انسانوں کو انسان بنانا ہے۔ اس کا کام تعمیر حیات ہے اس کی بخیہ گری یا تھگلی لگانا نہیں ہے جسم انسانی کی رفوگری یا کفش دوزی طبیبوں کے حصہ میں آئی ہے مگر اُستاد کا کام صحیح معنوں میں تعمیر حیات ہے۔

تعلیم کا عمل دوہاری تلوار ہے اور اس کے دو پہلو ہیں۔ جہاں ایک طرف اُستاد بچہ کی تعمیر حیات میں مشغول ہے۔ دوسری طرف بچہ ایک حد تک ایک چھوٹے پیمانے پر لیکن شاید زیادہ موثر انداز میں تعمیر حیات کے کام میں مصروف ہے۔ وہ تعمیر حیات کس کی ؟ اُستاد! شاید اپنے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر لوگ اس بارے میں اختلاف کریں لیکن ایک ٹریننگ کالج کے اُستاد کی حیثیت سے ذاتی تجربہ کی بنا پر میں تو یہی کہوں گا کہ بچوں نے اپنی ہمت سے ان نوسیکھوں (یعنی سیوبل ٹیچر) کو اکثر اُستاد کیا انسان تک بنا دیا ہے۔

ملا شدن چہ آساں انساں شدن مشکل

یہ تو آپس میں اَدلے کا بدلہ ہے۔ آپ بچوں کو انسان بنانے کی کوشش کریں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ وہ بھی آپ کو ٹریننگ اسکول سے نکلتے نکلتے انسان بنا کر چھوڑیں گے اور دوستو یہ انسان بنانے کا عمل کافی مشکل معلوم ہوتا ہے اس انسانی عمل کے قطرات میں نے (پسینہ کی شکل میں) اکثر نوسیکھوں کے منھ سے

ٹپکتے دیکھے ہیں۔ اور انھیں اُس جھاڑن سے صاف ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے جو اتفاقاً چاک کے سفید پوڈر سے بھرا ہوا استاد کے ہاتھ آ گیا تھا۔

میرے دوستو! ایک اُستاد کی شخصیت کا اثر گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ یہ اثرات کسی کھاری جھیل کی تہہ میں ان شیریں چشموں کی طرح ہوتے ہیں جو ان دیکھے اپنا خوشگوار عمل دن رات جاری رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی تنہائی اور مایوسی کی اندھیاری میں ایک بجلی سی چمک جاتی ہے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے گذشتہ ایام کی کوئی تصویر ابھر کر ذہنی پردے کے سامنے جلوہ آرا ہو جاتی ہے۔ یہ تصویر ہے کسی پرانے اُستاد کی جس نے روزمرہ کے تدریسی چکر سے ذرا اوپر اُٹھ کر زندگی کے ستار کو اس جوش اور گہرائی سے چھیڑا کہ اس کی لرزش اب تک روح کے تاروں کو مرتعش کر رہی ہے۔ اگر ہم ایسی یادوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان لمحوں میں ہمارے ذہن میں نصاب کا کوئی ایسا مضمون نہیں آتا جو اس اُستاد نے پڑھایا تھا۔ نصابی عنصر زیادہ دیرپا نہیں ہوتے بلکہ اکثر اوقات تو ہم ایک حد تک لکھا پڑھا بھلا دینا چاہتے ہیں اور نہیں بھلا سکتے۔ تعلیمی یادوں کا دیرپا اور مستقل پہلو وہ گہرا اثر ہے جو ایک زوردار اُستاد کی شخصیت اپنے طالب علم پر چھوڑ جاتی ہے بقول ایک مصنف کے اس اثر کے ماتحت اس نوجوان میں ایک نئے انداز کی ہستی تخلیق ہو جاتی ہے لیکن کتنے اُستادوں کو پتہ ہے کہ وہ کتنے نوجوانوں کے دلوں میں کتنے انسانوں کی زندگیوں میں دوبارہ

جسم لے رہے ہوتے ہیں اور ابدی زندگی پائے ہوتے ہیں۔ اگر ہم اپنی زندگی کے
دوسرے واقعات پر غور کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اس قدر گہرے اثرات
دوسرے واقعات کم چھوڑتے ہیں بہت کم۔ اکثر ادب یا آرٹ کا کوئی شاہکار
بچپن میں چھوٹی ہوئی والدہ کی یاد یا کوئی نفسیاتی زلزلہ جس نے زندگی کی
بنیادیں تک ہلا ڈالی ہوں۔

کسی اُستاد کا ایک طالب علم جب قوم کا محبوب قائد بن گیا تو اس کی
شہرت سن کر اُستاد نے کہا تھا کہ طور سینیٰ پر خدائے علم سے موسیٰ کی طرح ہم کلام
تو میں ہوا تھا میرے شاگرد نے تو ہارون کا کام کیا ہے۔ اس نے وہ پیغام
قوم کو پہنچا دیا اور بس۔ میرے دوستو اگرچہ اس جملہ میں ایک قابل معافی خود
پسندی کی جھلک ہے لیکن کچھ نہ کچھ حقیقت بھی ضرور ہے۔

اُستاد کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے الفاظ یاد رہیں گے۔ مدتوں نہیں
شاید صدیوں میرے دوستو کوئی نیکی کا کام کوئی نصیحت کا بیج بیکار نہیں
جاتا۔ ایک دفعہ ایک نوجوان کسان نے کرسچن کولڈ ڈنمارک کے کسان اُستاد
سے کہا کہ "آپ کی باتیں سننے میں لطف تو بہت آتا ہے لیکن بعد میں آپ کے
الفاظ یاد نہیں رہتے، بار بار کوشش کرتا ہوں مگر ملتے ہی نہیں"۔ کولڈ بولا۔
"کوئی بات نہیں یہ الفاظ کہیں گم نہیں ہوئے کہیں نہ کہیں تم میں ہی موجود
ہیں۔ اپنے وقت پر وہ خود بخود پھولیں پھلیں گے اور تمہیں پتہ بھی نہ ہوگا کہ وہ

کہاں ہیں جب تم گیہوں بوتے ہو تو تمہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ بیج کہاں گرے مگر تاہم وہ اُگتے ضرور ہیں۔"

اور پھر میرے دوستو! الفاظ بھی تو آخر کار ایک ظاہری لباس ایک اوپری سجاوٹ ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ ظاہری چیز اینٹ اور گارے کا گھروندا بن جائے جو اس من مندر کی قندیل کی کرنیں اپنے میں ہی سمٹا لے۔ یہ لباس بھی ان رنگین پردوں کا۔ ان روحانی لطیف نیتوں کا ہونا چاہیے جو حسن روح کی رنگینی کو دو آتشہ کر دکھائے لیکن پھر بھی لباس آخر لباس ہے۔ جب تک لباس والا نہ ہو تو لباس کیا کام آئے گا۔ میرے دوستو دیکھنا یہ ہے کہ ان الفاظ کی روح کیا ہو۔ وہ روح جو اکثر اپنا لباس خود بنا لیتی ہے۔

روح اور الفاظ، جذبہ اور پُرجوش طریق اظہار۔ یہ دو اُصول ہیں جن کی امداد سے معلمین نے قوموں کو زندہ کیا ہے۔ وہ بیانیہ طریقہ یا لکچر میتھڈ جو ہر ٹریننگ اسکول اور کالج کے لئے تختۂ ستم ہے ان کے ہاتھ میں کامیاب ذریعہ گرنٹ وگ ڈنمارک کا معلم جس نے اپنی قوم کو پچھلی صدی میں نئی زندگی بخشی انھیں دو اصولوں کے ذریعہ اپنی قوم کو بیدار کر رہا تھا۔ ایک تو اس کے پیغام میں عوام کی روح پوشیدہ تھی اور دوسرے اس کے زندہ اور جاندار الفاظ۔ زندہ الفاظ سے اس کی مُراد اس ذاتی تعلق اور جذبہ سے تھی جو اُستاد کے سینے سے بچہ کے دل میں گھر کرتا ہے اور اس کے من کے مندر میں اس

کی اس مقدس عبادت گاہ پر زندہ شعلہ بھڑکا دیتا ہے۔

گرنٹوگ کے نزدیک اُستاد ایک اُونچی روحانی قوت کا ذریعہ اظہار اور آلۂ کار تھا۔ اس کے ذریعہ سے روحانی دنیا کی رُویا دینے والی قوت ہماری دنیا میں زندہ اور جاندار الفاظ کے دھارے میں بہہ کر آرہی تھی۔

اس کا طریق تدریس یہ تھا کہ سب سے پہلے استادوں کو بیدار کرنے والے ترنم اور نغمے سے تعلیم شروع کرے۔ اسے انتہائی روشن اور زندہ تقریروں کے ذریعہ پڑھانا چاہیئے۔ اس کے لکچر میں زندہ واقعات جگمگا رہے ہوں۔ اس طریق پر پڑھانے سے وہ محض فکر او سمجھ کو اپیل نہ کرے بلکہ اس کا ہر لفظ روح کے بند دریچوں پر ایک ٹھوکا ہو۔

اور جب استاد دیکھے کہ اس کی روح کی گہرائیوں میں زندہ الفاظ تڑپ رہے ہیں اور قوت اظہار کے لئے بیتاب ہو رہے ہیں تو وہ اطمینان رکھے کہ اس کے الفاظ وسرزمین پر نہیں پڑیں گے۔ ایک دہکتے ہوئے انگارے کی طرح کہیں تو اقدار کی خس و خاشاک میں آگ لگادیں گے اسی خاک سے زمین پھر ایک دفعہ زندگی خیز اثرات سے مترنم ہو جائیگی اور اس میں تازہ پھول کھلنے لگیں گے اور کہیں یہ شعلہ بجلی کے ان پوشیدہ بجمروں کی طرح ہو جائے گا، جو بن دیکھے اپنی زندگی بخش حرارت پہنچا رہے ہوں۔

میرے دوستو! اگر نٹوگ ایک شاعر معلّم تھا اس نے شاعری کے انداز میں معلمی کی ایک معلّم کے انداز میں شاعری نہیں کی وہ لکچر ہیتھڈ کا شاعر تھا، شاعر یعنی اپنی وجدانی قوت سے روح کو اپنا لینے والا! میرے دوستو اسی معنی میں ہم سب ایک حد تک شاعر ہو سکتے ہیں، ایک حد تک تخلیقی کارکن ہو سکتے ہیں جس حد تک میکانکی طریق عمل، روزمرّہ کے چکر سے اوپر اٹھتے جائیں گے۔ ہم تدریس کی زمین پر ایک شاعر ہوں گے۔ دوستو! تم نے ڈالٹن پلان بھی پڑھا ہوگا، تم نے ہالسٹوری میتھڈ بھی یاد کیا ہوگا۔ یہ بڑے کام کی چیزیں ہیں مگر وہ اُستاد کیا جو اپنا طریق اپنا ڈھنگ خود تخلیق نہ کر سکے، فن تدریس ایک آرٹ ہے اور اُستاد ایک آرٹسٹ! تمہیں بھی طریق تعلیم کے محدود لیکن دلچسپ دائرے میں اس تخلیقی عمل کو جاری رکھنا ہوگا۔

تمہارا آرٹ اس قبیل کا آرٹ نہ ہوگا جیسے ادب، مصوری، یا سنگتراشی ہیں۔ ان میں آرٹسٹ کا مقصد اپنے روحانی تاثرات کا اظہار رہے۔ یہاں وہ اپنے مخصوص انداز میں اپنے مخصوص ذریعۂ اظہار میں اپنی روح کے اسرار کھول کے دکھا دیتا ہے، وہ پتھر یا الفاظ کو اپنی قوت متخیلہ کی امداد سے مجسّم یا رنگین بنا دیتا ہے۔ ایک سنگ تراش پتھر کو اپنے تخیّل کے مطابق جیسا دل چاہے تراش سکتا ہے مگر اُستاد بچے کو اس کی فطرت کے خلاف کوئی رجحان نہیں دے سکتا۔ اس کے برعکس اُستاد تو ایک ایسی فوج کا جرنیل ہے جو بچے کی روح کے میدان میں اخلاقی اور

معیاری زندگی کے لئے جنگ کرتا ہے، اس کے دست و بازو بچے کے وہ رجحانات ہیں جو اس کے تعلیمی منتہائے خیال کے حصول میں اس کے معاون ہیں اور اُس کے دشمن وہ میلانات ہیں جو اس کے راستے میں حائل ہیں، اس کا فرض ان دشمن عناصر کا مقابلہ کرنا ہے۔ اس جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک جرنیل کو صرف طریقِ جنگ کا ہی پتہ نہ ہونا چاہئے بلکہ اُسے میدانِ جنگ کے نشیب و فراز سے بھی واقف ہونا ضروری ہے اسے اپنے دستوں کو تازہ دم اور بلند ہمت رکھنا چاہئے، انھیں محفوظ جگہوں اور مناسب کمین گاہوں میں رکھنا چاہیئے۔ دشمن کی طاقت کا اسے اندازہ ہو، اور وہ حملے کے لئے ہمیشہ اچھے موقعوں کی تلاش میں رہے۔ کرشنس ٹائرز کی رائے میں تعلیم کا آرٹ یہ ہے۔

لیکن میرے دوستو! تعلیم کا آرٹ جنگ کا آرٹ نہیں حقیقی معنوں میں یہ امن کا آرٹ ہے، اگر ہم اس کے عملی پہلو سے گزر کر اس کے نتائج اور کامیابیوں پر غور کریں تو ہمارے لئے ایک اور تشبیہ شاید زیادہ کارآمد ثابت ہوگی۔

میری رائے میں جس آرٹ سے معلمی کا پیشہ سب سے زیادہ ملتا جلتا ہے وہ باغبانی کا آرٹ ہے۔ یہ تعلیمی کہانی کی وہ تاریخی تشبیہ ہے جس میں نئی تعلیم کی

تحریک کے کئی ایک پہلوؤں نے جنم لیا ہے میری رائے میں تو معلمی کا اصل آرٹ اس ڈنمارک کے آزاد مدرسوں کے اُس اُستاد کا آرٹ تھا جو انسانوں کی تربیت اُن پودوں کی طرح کرتا تھا جنہیں مدت سے نہ پانی ملا ہو اور نہ زندگی۔ اس کے اثر سے بچوں میں یوں معلوم ہوتا تھا گویا زندگی کے گہرے اور تاریک سائے اُن پر اُٹھتے چلے جا رہے ہیں، اُن کی بہترین خصوصیات روشن ہوتی چلی جا رہی ہیں، اُن کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو چلی ہے، اور اُن کے چہروں پر زندگی کی سُرخی دوڑ چکی ہے۔"

دوستو یہ ہے زندگی کا تخلیقی آرٹ